لغزش

ایم اے راحت

اس نے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ اس رات میں بہت دیر تک اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہی۔ مجھے اپنی خطا کا تو احساس ہوگیا تھا۔ مگر صرف اس قدر کہ میں نے نوید کو پہچاننے میں غلطی کی۔ دولت کی خواہش کا جنون بدستور دماغ میں موجود تھا اور میں اس انداز میں سوچ رہی تھی کہ اب گھر واپس جانے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اپنے امکان کی آخری حد تک نوید سے مقابلہ کروں گی۔ اور اسے مجبور کر دوں گی کہ وہ مجھ سے کیے گئے وعدے پورے کرے اور اگر بدقسمتی سے اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکی تو پھر خود ملازمت کرکے محنت کرکے اپنی منزل تک پہنچنے کی جدوجہد کروں گی۔

ایک متاثر کن کہانی عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے

میرا نام صباء ہے۔ میرے والدین اوسط درجے کے سفید پوش طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ہم آٹھ بہن بھائی تھے۔ تین بھائی اور پانچ بہنیں والد صاحب نے جو ایک غیر ملکی کمپنی میں کلرک تھے۔ اپنے وسائل اور بساط سے بڑھ کر ہم لوگوں کی پرورش کی' تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا اور تنگدستی کے باوجود شاید بہتر انداز میں اس ذمے داری سے سبکدوش ہوجاتے۔ اگر ان کا اور والدہ کا باہمی اختلاف رائے اکثر و بیشتر گھر کی فضاء کو مکدر اور بچوں کو مزاج و فطرت کو دن بہ دن بے پرواہ اور خود غرض بناتا نہ چلا جاتا۔

تعلیم سب ہی بہن بھائیوں نے حاصل کی تھی اور کر رہے تھے۔ چنانچہ میں نے بھی کسی نہ کسی طرح بی اے پاس کرلیا تھا۔ تمام بہن بھائیوں میں میں سب سے بڑی تھی۔ اس لیے فطری طور پر میرے میٹرک پاس کرتے ہی والدین' خصوصاً والدہ صاحبہ کو میری شادی کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔

متوسط گھرانوں کی لڑکیوں کی شادی کا معاملہ آج سے نہیں برسہا برس سے ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ صرف وہ لوگ نسبتاً اطمینان بخش پوزیشن میں ہوتے ہیں جن کی بیٹیاں گوری' دراز قد اور خوب صورت ہوں۔ اس اعتبار سے ہم پر اللہ کا بڑا فضل تھا۔ ہم سب بہنیں ماشاء اللہ' شکل و صورت' قد و قامت کی بہت اچھی تھیں اور میرے بارے میں تو خاندان کے ہر فرد کا یہ کہنا تھا کہ خدا نظر بد سے بچائے صباء تو چاند کا ٹکڑا ہے۔ جس گھر میں جائے گی اجالا کردے گی۔

چنانچہ آنے والے پیاموں میں کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ سلسلہ تو میٹرک میں پہنچنے سے پہلے ہی شروع ہوچکا تھا۔ مگر ظاہر ہے۔ تمام پیام یا تو خاندان میں کسی نہ کسی رشتے دار گھرانے سے تھے یا ان ملنے جلنے والوں کی طرف سے جن کا ہمارے ہاں' آنا جانا تھا۔ تمام لڑکے یا تو کلرک اور ٹائپسٹ وغیرہ تھے یا چھوٹا موٹا کاروبار کرتے تھے۔ ان سب میں جو قدرے غنیمت رشتہ تھا' وہ والد صاحب کے ایک دوست کے بیٹے کا تھا۔ جس نے بی' اے' ایل ایل بی کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایک بڑے شہر میں کسی پرانے وکیل کی ماتحتی میں اپنی پریکٹس کا آغاز کیا تھا لیکن شادی اور آئندہ زندگی کے بارے میں میرے اپنے ذاتی خیالات اور نظریات تھے۔ میں نے ہوش سنبھالنے سے اس وقت تک اپنے والدین کے گھر میں جس قسم کے حالات دیکھے تھے۔ ان سے میں انتہائی دل برداشتہ اور نالاں تھی۔

کبھی کسی بات اور کسی معاملے میں ہم وہ نہیں کرسکے تھے جو ہم چاہتے تھے' میرے بکس میں ایک وقت میں کبھی چار سے زیادہ جوڑے نہیں رہے اور یہ کپڑے بھی ایسے نہیں ہوتے تھے۔ جنہیں ہم فخریہ پہن کر کسی تقریب میں جا سکیں۔ اسکول کے سفید کینوس شوز کے علاوہ سال میں صرف عید کے موقعے پر جوتوں کا ایک جوڑا خریدا جاتا تھا۔ جسے اگلی عید تک مرمت کرا کرا کر استعمال کرنا پڑتا تھا۔

سرمہ' کاجل' ابٹن اور مہندی کے علاوہ گھر میں کوئی بھی سنگھار کی چیز نہیں آئی۔ عیدی پر جو پیسے جمع ہوتے تھے۔ ان سے ہم لڑکیاں کبھی کبھی انتہائی گھٹیا قسم کی لپ اسٹک' پوڈر تک چلانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ زندگی کی دوسری آسائشوں کا حال یہ تھا کہ ایک مدت تک ہمارے یہاں کوئی ریڈیو بھی نہیں تھا۔ ٹی وی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سہولتوں سے محروم اس زندگی نے دوسرے بہن بھائیوں کے ذہن پر جو بھی اثر کیا ہو۔ میرے دل میں دولت کی ایک زبردست خواہش پیدا کردی تھی۔ میں کسی کلرک یا کلرک جیسے شخص سے شادی کرکے اپنی آئندہ زندگی کو ایک ایسے ہی ماحول میں جھونکنا نہیں چاہتی تھی۔ جیسا ہمارے گھر میں تھا اور جس سے فراز ہونے کے خواب میں بچپن سے جوانی تک دیکھتی آئی تھی۔

☆☆

کالج میں کئی دولت مند گھرانوں کی لڑکیاں میری دوست تھیں۔ اس سے قطع نظر کہ امتحان میں میں ٹاپ کروں یا نہ کروں ہر سبجیکٹ کا ہر پیریڈ ضرور اٹینڈ کرتی تھی اس وجہ سے جتنے مکمل نوٹس میرے پاس ہوتے تھے۔ شاید ہی کسی دوسری لڑکی کے پاس ہوتے ہوں اور وہ امیر لڑکیاں جن میں سے بیشتر کالج میں شادی سے پہلے صرف اپنا وقت گزارنے' گلیمر دکھانے اور اپنے نام کے آگے ایک ڈگری کا اضافہ کرنے آتی تھیں' بہرحال پاس ہونے کے لیے امتحان دینے پر مجبور تھیں۔ ایسی ہی ایک لڑکی نورین آفتاب تھی۔ بڑی ماڈرن' بڑی آزاد خیال اور بڑی بے باک۔ اس کا ایک بھائی بھی تھا۔ جمشید بالکل نورین کی کاربن کاپی مگر شرٹ اور چینٹ میں جس طرح نورین ہر وقت دو چار خوشامدی سہیلیوں کو ساتھ رکھتی تھی۔ اسی طرح جمشید کی بھی ایک چنڈال چوکڑی تھی۔ جن میں ایک لڑکا' نوید خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ اول اس لیے وہ بہت خوب صورت تھا۔ اور دوسرے اس لیے کہ اس کے والد ایک بہت بڑے کاروباری تھے۔

ابتداء میں جمشید نے مجھے لبھانے اور رجھانے کی بہت کوشش کی مگر میں ناتجربے کار اور جذباتی لڑکی ہونے کے باوجود اتنی بات ضرور سمجھتی تھی کہ ان لاابالی نوجوانوں کے جانے کتنی ہی لڑکیوں سے تعلقات ہوں۔ کوئی بھی کسی لڑکی کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہے۔ میں نے ان کی باتیں سنی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو بڑے فخریہ انداز میں لڑکیوں کو بے وقوف بنانے کے واقعات سناتے تھے اور اسے ایڈونچر کہتے تھے اس لیے میں نے کبھی جمشید کو لفٹ نہیں دی۔

لیکن وہ لڑکا نوید ضرور میرے ذہن کے کسی گوشے میں چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی نسبت شرمیلا اور بزدل تھا۔ اس نے کبھی مجھ سے براہ راست بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مگر میں نے اس کی نظروں میں اپنے لیے پسندیدگی کے تاثرات ضرور دیکھے تھے۔

بی اے فائنل کے سالانہ امتحانات کے بعد نورین کی دوستی اور اس کے گھر آنے جانے کا باب بھی اختتام کو پہنچا۔ اس سے آخری ملاقات اس دن ہوئی تھی جب ہم دونوں اپنا پروویژنل سرٹیفکیٹ لینے کالج آئی تھیں اور تب ہی اس نے بتایا تھا کہ اس کی شادی طے ہوچکی ہے۔ اس کے دولت مند باپ کو جس کی وہ اکلوتی بیٹی تھی۔ ایک پالتو قسم کا داماد مل گیا ہے۔ اس لیے وہ شادی کے بعد خود وداع ہونے کے بجائے اپنے شوہر کو رخصت کرا کے بنگلے میں لے آئے گی۔

جب گھر میں میری شادی کے چرچے زور و شور سے ہونے لگے تب مجھے نوید یاد آیا' وہ ہر دوسرے' تیسرے ہفتے اپنے آبائی شہر اپنے باپ سے ملنے جاتا رہتا تھا اور جب بھی واپس آتا' بڑے شہر کی دلچسپیوں اور اپنی شاہانہ سیر و تفریح کا تذکرہ کچھ ایسے انداز میں کرتا کہ مجھے یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ میرے دیکھے ہوئے خواب بیان کرتا چلا جارہا ہے' مجھے اس کی وہ نظریں بھی یاد تھیں۔ جن سے وہ میری طرف دیکھا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر مجھے اس سے بہتر کوئی شخص نظر نہیں آیا جو میری مدد کرسکتا ہو۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں اس سے ذرا بھی اپنی توجہ کا اظہار کروں تو وہ اپنے والدین کو ضرور پیام دے کر بھیج دے گا۔

میں اسی سوچ میں تھی کہ کیا کروں۔ کیسے نوید کا پتہ معلوم کرکے اسے رشتہ بھیجنے پر مجبور کروں کہ میرے والدین نے ایک پیام منظور کرلیا اور جیسا کہ اندازہ تھا۔ یہ وہی وکیل صاحب والا رشتہ تھا۔ میں نے اپنی چھوٹی بہن کی

معرفت والدہ سے کہلوایا بھی کہ میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی لیکن ایسے معاملات میں والدین اپنی بیٹیوں کی کوئی بات سننے کے روادار نہیں ہوتے۔ لڑکیوں کے جذبات و خیالات پر کون توجہ دیتا ہے۔ والدہ نے بے پروائی سے کہہ دیا کہ پڑھ لکھ کر اس لڑکی کا دماغ خراب ہو گیا ہے وہ ابھی نادان ہے۔ ناتجربے کار ہے۔ ہم نے اس کے لیے جو فیصلہ کیا ہے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے اور اللہ نے چاہا تو اس کے حق میں بہترین ثابت ہوگا۔

اس جنریشن گیپ کے پروپیگنڈے نے اولاد کو اور بھی والدین سے برگشتہ کر رکھا ہے۔ اب کوئی بھی اختلافی معاملہ ہو۔ بچے جنریشن گیپ کی آڑ میں چھپ کر بزرگوں کو سو فیصد غلط بلکہ کوئی بھی درست فیصلہ کرنے کے لیے نااہل قرار دے دیتے ہیں یہی سوچ اس وقت میری تھی۔ بڑا تاؤ آتا تھا کہ جناب! ٹھیک ہے۔ ماں باپ نے پال پوس کر بڑا کیا۔ پڑھایا لکھایا لیکن جب ہم اپنا بھلا برا سوچنے کے قابل ہو گئے تب بھی انہیں ہم پر اپنے فیصلے تھوپنے پر اصرار کیوں ہے۔

جب میرے احتجاج کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں پورے زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ اب بھی اگر میں نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا تو میرے تمام خوابوں' تمام آرزوؤں کو عروسی کفن پہنا کر زندہ درگور کر دیا جائے گا۔

میں نے ایک روز اپنی پڑوسی سہیلی کے گھر سے نورین کو فون کیا کہ میری زندگی اور موت کا مسئلہ درپیش ہے۔ تفصیل میں اس سے مل کر بتاؤں گی۔ بس وہ کسی دن آ کر مجھے اپنے گھر لے جائے اور اتفاق سے دوسرے ہی دن آ گئی۔ اس وقت مجھے ایک طرح سے حیرت ہوئی کہ وہ کسی کی پکار پر اتنی جلدی لبیک کہنے والوں میں سے نہیں تھی۔ میں اسے اس کا خلوص سمجھی۔

یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ ان دنوں اس کے گھر میں میرا ذکر اکثر و بیشتر ہو رہا تھا اور اگر میں اسے فون نہ کرتی تو وہ خود کسی بہانے مجھ سے ملنے آ جاتی۔ بہرحال مجھے بڑی خوشی ہوئی اور وہ میری والدہ سے اجازت لے کر مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ والدہ اسے جانتی تھیں۔ کالج کے زمانے میں بھی میں اس کے گھر جاتی رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

دوسری حیرت مجھے نورین کے گھر پہنچ کر ہوئی۔ کیونکہ نوید وہاں پہلے سے موجود تھا۔ تب میں نے اس بات کو اپنی خوش قسمتی سمجھا کہ خود تقدیر بھی میرے ارادوں کا ساتھ دے رہی ہے۔ نوید کو میں نے تقریباً ایک سال کے بعد دیکھا تھا اور اس دوران اس میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ وہ پہلے کی طرح شرمیلا اور نظریں جھکا کر بات کرنے والا نہیں تھا۔ بلکہ بڑا شوخ اور بے باک ہو گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ بی اے پاس کر لینے کے بعد اس کے ڈیڈی اب یہ چاہتے ہیں کہ وہ خود بھی کوئی اپنا کاروبار کرے' اس لیے وہ جلد ہی مستقل طور پر اپنے شہر منتقل ہونے والا ہے۔ جانے سے پہلے وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ تاکہ مجھے وہ بات بتا سکے جسے کہنے کا اسے اب تک حوصلہ نہیں ہوا تھا۔

اس نے کہا کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے اور مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اگر میرے خیالات بھی یہی ہوں تو وہ اپنی والدہ کو جو کہ اسی شہر میں رہتی ہیں میرے گھر بھیجے تاکہ وہ رشتے کی بات کر سکیں۔

میں نے جواب دیا کہ میری شادی طے ہو چکی ہے اور میں اسی سلسلے میں نورین سے ملنا چاہتی تھی۔ تاکہ وہ میری والدہ کو کسی طرح سمجھا بجھا کر شادی رکوا سکے۔ میں نے اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں بڑے سہانے خواب دیکھے ہیں اور کوئی بھی تھرڈ کلاس وکیل میرے ان خوابوں کی تعبیر نہیں بن سکتا۔ نورین نے نوید کا ساتھ دیا اور مجھے سمجھایا کہ اگر میں سچ مچ عیش و آرام کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں تو مجھے نوید کی پیش کش قبول کر لینا چاہیے۔ مگر میں جانتی تھی کہ اب وقت گزر چکا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ذاتی طور پر تو مجھے کوئی انکار نہیں ہے لیکن نوید کی ماں رشتہ لے کر آئیں بھی تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ میرے والدین اس وکیل کے ماں باپ کو زبان دے چکے ہیں۔

ہم تینوں نے مل کر غور کیا کہ ان حالات میں اپنی آرزوؤں کا تاج محل تعمیر کرنے کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کیا جا سکتا ہے۔ نورین نے رائے دی کہ تم دونوں پوشیدہ طور پر شادی کر لو ظاہر ہے کہ تم لوگ کوئی گناہ نہیں کر رہے ہو۔ شادی کر رہے ہو۔ یہ شادی والدین کی بغیر اجازت ان کی مرضی کے خلاف ضرور ہوگی۔ جس پر وہ بے شک خفا بھی ہوں گے لیکن یہ ناراضگی زیادہ دن قائم نہیں رہے گی۔ جب ان کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو وہ ماں باپ کی دیرینہ شفقت سے کام لیتے ہوئے تمہیں معاف کر دیں گے۔ میں بھی جانتی تھی کہ کسی انقلابی اور جرات مندانہ اقدام کے بغیر میں اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتی لیکن میں بہرحال ایک گھریلو قسم کی لڑکی تھی اور ایک دم سے کسی کی پشت پناہی کے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کرنا میرے لیے مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ اس موقع پر نوید نے میری بڑی ہمت بندھائی قسمیں کھا کھا کر زندگی بھر ساتھ دینے کے وعدے کیے اور بالآخر یہ طے پایا کہ ان حالات میں شادی تو ظاہر ہے چھپ کر دوسرے الفاظ میں والدین کی اجازت کے بغیر ہی کرنا ہوگی لیکن شادی کرنے کا مطلب ہے گھر سے قطع تعلق اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک کوئی دوسرا گھر نہ ہو۔ شادی کے بعد بھی بہرحال ایک گھر کی ضرورت ہوگی اس لیے نوید ایک مناسب گھر کا انتظام کریں اور کسی دوسرے شہر میں ہفتے بھر میں واپس آئیں اور آج سے ٹھیک پندرہ دن کے بعد ہم دوبارہ نورین کے گھر ملاقات کریں۔ جس کے بعد یہاں سے روانگی کا پروگرام بنایا جائے گا۔

☆☆

اور پھر دسمبر کی ایک سرد رات میں میں نے وہ گھر چھوڑ دیا۔ جہاں سے تشنگی اور محرومی کے ایک جان لیوا احساس کے علاوہ شاید میں نے کچھ بھی نہیں پایا تھا۔ رخصت تو بہرحال مجھے ہونا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ میرے والدین مجھے جس اندھیرے میں جھونک رہے تھے۔ میں نے اس سے بچ کر ایک روشن مستقبل کی طرف قدم بڑھائے ہیں اور اس تاریک رات کے بعد جو صبح ہوگی۔ وہ میرے لیے خوشیوں کی روشن روشن کرنوں کی پیامبر بن کر آئے گی۔ وقت کی کمی اور ہنگامی صورت حال کے تحت نورین کے گھر پر ہی خفیہ طور پر نکاح کی رسم ادا کی گئی لیکن میری یہ شادی ایسی تھی کہ نہ میں دلہن بن سکی اور نہ ہی دیگر رسومات کی ادائیگی ہوئی۔ بس نورین اور نوید کے چند واقف اس پروگرام میں شریک ہوئے۔ میں ایک کمرے میں نورین کے ہمراہ بیٹھی تھی کہ تین افراد وہاں آئے ایک نے میرے وکیل کی حیثیت سے بات کی اور دوسرے دو افراد بحیثیت گواہ تھے۔ انہوں نے نکاح نامے پر میرے دستخط لیے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ ذہن میں دبے ہوئے کسی نامعلوم اندیشے کے باوجود مجھے اس انتظام پر راضی ہونا پڑا۔

اور پھر دوسرے شہر جا کر نوید نے ایک کوارٹر کرائے پر لے لیا تھا۔ بعد میں وہاں رہنے سے معلوم ہوا کہ وہ ایف ٹائپ کوارٹرز کہلاتے تھے۔ شروع کے دو چار دن تو میں خاموش رہی لیکن پھر میں نے نوید سے اپنے ان خدشات کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ جو نکاح کے بعد سے

میرے ذہن میں پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن اس نے مجھے تسلی دلاسے دینے کے علاوہ بھی کوئی معقول بات نہیں کی۔

اس دوران میرے ساتھ اس کا سلوک ہر اعتبار سے ایک مثالی شوہر جیسا رہا۔ اس نے ضرورت کی ہر چیز گھر میں فراہم کر دی تھی۔ چار پانچ اچھے جوڑے بھی بنوا کر دیے ایک دو نگلے زیور بھی میری پسند سے خریدے، کم و بیش ہر شام کو وہ مجھے کہیں نہ کہیں سیر و تفریح کے لیے بھی لے جاتا رہا۔ اپنے دو تین دوستوں سے بھی ملایا۔ ان ہی دوستوں میں اس کا ایک بے تکلف دوست کاشف بھی تھا۔ جو اکثر اس کے سامنے اور اس کے پیچھے ہمارے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔ بڑا چرب زبان اور باتونی تھا اور میں اسے اچھا نہیں سمجھتی تھی۔ اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں طبیعت میں ایک کراہیت کا احساس ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ نوید کا دوست تھا اور میں اسے آنے سے منع نہیں کر سکتی تھی۔

جب ان شب و روز کے ساتھ تیسرا مہینہ بھی ختم ہونے لگا تو میں زیادہ صبر نہ کر سکی اب تک وہ مجھے اپنے طریقوں سے مطمئن کر چکا تھا۔ نکاح نامہ بھی بقول اس کے نورین کے پاس تھا اور خود میرے پاس اپنے تحفظ کے لیے ایسا کوئی ثبوت نہ تھا۔ جس کے ذریعے میں نوید پر اپنی گرفت مضبوط رکھ سکتی۔ نوید روزانہ صبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے یہ کہہ کر چلا جاتا تھا کہ وہ اپنے کام پر جا رہا ہے اور پھر شام کو..... پانچ چھ بجے واپس آ جاتا تھا لیکن پھر رفتہ رفتہ چھ سے سات، سات سے آٹھ اور آٹھ سے نو دس بجنے لگے۔ میں پوچھتی تو وہ جواب دیتا کہ آج کل کام کی زیادتی ہے اور اگر اسے مستقبل میں کوئی اچھا مقام حاصل کرنا ہے تو محنت تو کرنا ہی پڑے گی اور میں خاموش ہو جاتی تھی لیکن اس دن وہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے آیا تو مجھے بولنا ہی پڑا۔

''آخر اس دیر سے آنے کی حد کہیں جا کر ٹھہرے گی بھی یا نہیں۔'' میں نے بگڑ کر پوچھا۔

''کیا مطلب۔؟''

''مطلب یہ کہ پہلے تم چھ بجے تک گھر آ جاتے تھے۔ پھر یہ ٹائم بڑھ کر نو دس بجے تک پہنچا اور آج ساڑھے گیارہ بجے تشریف آئی ہے۔''

''میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ کام کی مصروفیت میں دیر ہو جاتی ہے۔ تمہیں حالات سے سمجھوتہ کرنے کی عادت ڈالنا چاہیے۔ آئندہ اس سے بھی زیادہ دیر ہو سکتی ہے۔''

''مجھے ایسا کام پسند نہیں جو تمہیں آدھی رات سے زیادہ گھر سے باہر رکھے۔''

''مگر مجھے اپنا مستقبل بنانا ہے اور اس کے لیے آدھی رات کیا اگر دن و رات گھر سے باہر رہنا پڑا تب بھی رہوں گا۔''

''دنیا میں تم انوکھے آدمی نہیں ہو جو اپنے مستقبل کی تعمیر کر رہے ہو۔'' میں نے جواب دیا۔

''اور دنیا میں تم انوکھی عورت بھی نہیں ہو۔ وہ بھی بیویاں ہوتی ہیں کہ شوہر رات کے تین بجے بھی گھر آئے تو خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتی ہیں۔''

''بیوی! تم نے مجھے ابھی تک میرا نکاح نامہ ہی کب دیا ہے۔'' میں تیزی سے بولی۔ ''اور اس ایک بات سے تمہارے الفاظ کی بے وقعتی ثابت ہو جاتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں کہ وہ کون سی وجوہات ہیں جو تمہیں نکاح نامہ میرے حوالے کرنے سے روکتی ہیں۔''

''اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کاغذ کا ایک بے حقیقت پرزہ حاصل کرنے پر تمہیں اتنا اصرار کیوں ہے۔'' نوید نے جواب دیا۔ ''آخر وہ کیا چیز ہے جو تمہیں اب حاصل نہیں اور اس پرزے کو حاصل کرنے کے بعد حاصل ہو جائے گی۔''

''نکاح نامہ ایک مقدس دستاویز ہے۔ جس کے ذریعے دنیا والوں اور قانون کی نظر میں تحفظ کا احساس ہوتا ہے اور میں یہ تحفظ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔''

''بے کار باتیں مت کرو۔ اس پورے مسئلے کا تعلق خود فریقین کے اپنے احساسِ بے داری اور فرض شناسی سے ہے۔ اگر کسی کو اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں تو تم اسے کسی قانونی یا اخلاقی بندش سے باندھ کر نہیں رکھ سکتیں۔''

''دوسرے الفاظ میں تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ مجھے یہ تحفظ مہیا نہیں کرو گے۔'' مجھے نوید کے رویے سے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔

''ہاں، میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اب یہ بحث ختم کرو اور ایک بات اچھی طرح سمجھ لو کہ آئندہ تم نے ایسی باتیں کیں تو پچھتاؤ گی۔''

نوید جس انداز سے بدل رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے کسی ایسی ہی بات کا اندیشہ میرے دل میں پیدا ہو چکا تھا۔ اس دن جو وہ کھل سامنے آیا تھا تو اپنے اندیشے کو حقیقت بنتے دیکھ کر پہلے تو میں خوفزدہ ہو گئی۔ مگر پھر اس کی دغا بازی پر غصہ آ گیا۔ یہ بات اب میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ کبھی بھی اپنی محبت میں مخلص نہیں تھا۔

''نہیں نوید تم اتنی آسانی سے دامن جھٹک کر الگ نہیں ہو سکتے۔'' میں نے تیزی سے کہا۔ ''میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر تمہارے ساتھ آئی تھی۔ اب کھونے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں چوبیس گھنٹے کا الٹی میٹم دیتی ہوں۔ اگر کل شام تک تم نے نکاح نامہ میرے حوالے نہیں کیا تو نتائج کی تمام ذمہ داری تمہارے سر ہو گی۔''

''ٹھیک ہے۔ تم سے جو ہو سکے وہ کر لینا۔'' نوید نے بے پروائی سے کہا۔ ''میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ سونے جا رہا ہوں۔''

اس نے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اس رات میں بہت دیر تک اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہی۔ مجھے اپنی خطا کا تو احساس ہو گیا تھا۔ مگر صرف اس قدر کہ میں نے نوید کو پہچاننے میں غلطی کی۔ دولت کی خواہش کا جنون بدستور دماغ میں موجود تھا اور میں اس انداز میں سوچ رہی تھی کہ اب گھر واپس جانے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اپنے امکان کی آخری حد تک نوید سے مقابلہ کروں گی۔ اور اسے مجبور کر دوں گی کہ وہ مجھ سے کیے گئے وعدے پورے کرے اور اگر بدقسمتی سے اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی تو پھر خود ملازمت کر کے محنت کر کے اپنی منزل تک پہنچنے کی جدوجہد کروں گی۔

مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ اپنے والدین کے گھر سے باہر قدم نکال کر میں نے جس عاقبت نااندیشی کا کام کیا ہے۔ یہ محض اس کی پہلی ٹھوکر تھی اور مجھے اپنی حماقت کی سزا میں ایسی نہ جانے کتنی ٹھوکریں کھانا اور برداشت کرنا پڑیں گی۔ رات کو دیر تک جاگنے کی وجہ سے میں ایسی گہری نیند سوئی کہ رات کے اندھیرے میں گرنے والی قیامت کی آہٹ تک نہ سن سکی۔ صبح سو کر اٹھی تو معلوم ہوا کہ نوید مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکا ہے۔

☆☆

میرے نام ایک مختصر سے خط میں اس نے لکھا تھا کہ جو لڑکی اپنے والدین سے اپنے بہن بھائیوں سے، اپنے خاندان کی عزت اور نیک نامی سے وفا نہیں کر سکی۔ اسے کسی دوسرے کو بے وفا کہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا اور نہ ہی کوئی اس سے وفاداری کی امید کر سکتا ہے۔ اس لیے وہ جا رہا ہے۔ اس کی طرف سے میں آزاد ہوں کہ اپنے بارے میں اپنے مستقبل کے بارے میں جو چاہوں فیصلہ کر دوں۔ جو چیزیں اس نے مجھے دی

تھیں۔ اگرچہ ان پر میرا حق نہیں بنتا مگر وہ بطور احسان انہیں چھوڑے جا رہا ہے۔ مکان کا کرایہ بھی ایک ماہ کا ایڈوانس دیا جا چکا ہے۔ اس لیے میں چاہوں تو ایک ماہ تک اس مکان میں رہ سکتی ہوں۔ جس کے بعد یا تو مجھے مکان چھوڑنا ہوگا یا مالک مکان سے بات کر کے اسے دوبارہ ایڈوانس دینا ہوگا۔ کیونکہ جو ایڈوانس اس نے دیا تھا۔ وہ واپس لے لیا ہے۔ اس کی دعا ہے کہ زندگی میں اب دوبارہ کبھی مجھ سے ملاقات نہ ہو لیکن اگر کبھی ایسا سوئے اتفاق پیش آ ہی گیا تو وہ مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دے گا۔

مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ایک اجنبی شہر میں تمام عزیزوں اور دوستوں سے دور بالکل تنہا اور بے سہارا حیثیت میں اس قسم کا خط پڑھ کر میرے دل پر کیا قیامت گزر گئی ہوگی۔ میں اپنی بدنصیبی پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں سمجھی شاید پڑوس سے کوئی آیا ہو۔ اس لیے جلدی سے آنسو پونچھ کر اور چہرے کو حتی الامکان ہشاش بشاش بنانے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سامنے کاشف کھڑا تھا۔ نوید کا وہ دوست جو ہر تیسرے چوتھے دن آتا رہتا تھا۔

''السلام علیکم! صباء صاحبہ!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور گھر میں آ گیا۔ مجھے مجبوراً ایک طرف ہٹتے ہوئے اسے راستہ دینا پڑا تھا۔

''نوید گھر میں ہے۔'' کاشف نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''کمال ہے۔ اتنی جلدی گھر سے نکل گیا۔ آپ ذرا اس پر اپنی گرفت قائم رکھیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ آجکل راتوں کو بھی دیر تک باہر رہتا ہے۔'' ضبط کرنے کے باوجود میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ارے آپ رو رہی ہیں۔'' کاشف نے

چونک کر پوچھا۔ ''کیا نوید سے جھگڑا ہو گیا ہے۔''

مجھے اس پردیس میں بہرحال کسی ہمدرد اور مددگار کی ضرورت تھی۔

''وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔'' میں نے ترش لہجے میں جواب دیا اور نوید کا لکھا ہوا خط کاشف کے سامنے ڈال دیا۔

کاشف نے خط پڑھا' شاید کئی بار اور دیر تک اسے الٹتا پلٹتا رہا۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''یہ اس نے اچھا نہیں کیا۔'' آخر وہ بولا۔ ''اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ جو لڑکی اپنا سب کچھ چھوڑ کر صرف اس کی محبت کے سہارے گھر سے نکل آئی ہے۔ وہ اس صدمے کو کیسے برداشت کرے گی۔''

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ یہ ہمدردانہ الفاظ کانوں میں پڑے تو میری ہچکیاں بندھ گئیں۔

''دل کے معاملات ہیں۔ میں کچھ بول بھی نہیں سکتا۔'' کاشف نے کہا۔

''مگر سچ پوچھیے تو بارہا میں نے سوچا کہ آخر آپ جیسی پڑھی لکھی سمجھ دار' خوب صورت لڑکی نے نوید جیسے لاابالی' خودغرض نوجوان میں ایسی کیا بات دیکھی تھی کہ اپنی پوری زندگی داؤ پر لگا دی۔ بہرحال یہ وقت پچھتانے اور غلطیوں پر تنقید کرنے کا نہیں ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں میرا خیال ہے۔ بات ابھی بالکل ہی ہاتھ سے نہیں نکلی۔ نوید کو پکڑا جا سکتا ہے۔''

ہرچند کے نوید کے طرز عمل نے میرے دل میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ مگر ظاہر تھا کہ اب میں وہ پہلے والی صباء نہیں رہی تھی۔ گھر سے کسی لڑکے کے ساتھ فرار ہونے کے بعد یہ توقع نہیں کر سکتی تھی کہ کوئی شریف نوجوان مجھے قبول کر سکے گا۔ آئندہ مجھے تن تنہا جدوجہد

کر کے زندہ رہنا تھا اور یہ کوئی آسان بات نہیں تھی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اگر کسی طرح اب بھی نوید کو مجبور کر کے شادی پر آمادہ کیا جا سکے تو بے شک ہماری ازدواجی زندگی خوشگوار ہونے کی کوئی توقع نہیں۔ مگر مجھے معاشرے میں عزت تحفظ اور جائز مقام تو حاصل رہے گا۔

''نوید کو پکڑنے سے آپ کا کیا مطلب ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''شاید نوید نے آپ کو بتایا ہو کہ وہ آجکل اپنا کاروبار سیٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔'' کاشف نے جواب دیا۔ اس سلسلے میں میرا اور اس کا مشترکہ دوست زبیر خان اس کا بزنس پارٹنر ہے۔ آپ میرے ساتھ زبیر خان کے پاس چلیے اسے اپنی داستان سنایئے۔ میں بھی آپ کی تائید کروں گا۔ زبیر خان اس پوزیشن میں ہے کہ نوید کو مجبور بھی کر سکتا ہے اگر اس نے آپ کی مدد کرنے کا وعدہ کر لیا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا کیونکہ نوید اس سے انکار کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا اس کا لاکھوں روپیہ اس مشترکہ بزنس میں پھنسا ہوا ہے۔'' بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ میں آمادہ ہو گئی۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ کاشف بھائی۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اگر آپ نے میری زندگی تباہ ہونے سے بچالی تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔''

''اس میں احسان کی کوئی بات نہیں صباء صاحبہ! میں وہی کر رہا ہوں جو مجھے کرنا چاہیے۔''

''میں چلنے کے لیے تیار ہوں کب چلیں گے۔''

''آج شام کو۔'' کاشف نے بتایا۔ ''صبح سے شام چھ بجے تک زبیر اپنے آفس میں ہوتا ہے اور وہاں جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ نہ زبیر ٹھیک طرح ہماری بات سن سکے گا اور نہ ہی کچھ کر سکے گا۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں نوید موجود ہو اور اس نے دیکھ لیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔''

''کیسی گڑبڑ۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ کہ آپ کا کام خدا نے چاہا تو بن ہی جائے گا۔'' کاشف نے جواب دیا۔

''مگر نوید سے میری دوستی بگڑ جائے گی۔ وہ میرا دشمن بن جائے گا۔''

یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی تھی۔

''اچھی بات ہے شام کو ہی سہی۔ کس وقت آئیں گے۔''

''بس یہ ہی کوئی سات' آٹھ بجے۔'' کاشف نے جواب دیا۔

وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ مجھے مزید تسلی دے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ناشتا بنایا۔ منہ ہاتھ دھویا' ناشتا کیا اور ذہن پر خیالات کی یورش اور ہزاروں فکروں کے باوجود میں نے وہ دن نارمل انداز میں گزارنے کی کوشش کی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ پاس پڑوس میں کسی کو اس بات کی بھنک بھی ملے کہ میرے اور نوید کے درمیان کیا ہو رہا ہے۔

کاشف ساتھ آٹھ بجے آنے کے لیے کہہ کر گیا تھا مگر تقریباً نو بجے آیا۔ میں اس کے آنے سے مایوس ہو چکی تھی اور دل میں سوچ رہی تھی کہ اس نے مجھے محض ایک جھوٹی تسلی دی تھی ورنہ ظاہر تھا۔ اسے کیا غرض پڑی تھی کہ نوید سے اپنے دوستانہ تعلقات کو خطرے میں ڈالتا۔ مگر جب وہ نو بجے پہنچا تو پہلے خیال کی تردید ہو گئی لیکن وہ وقت مجھے کسی سے ملنے جانے کے لیے مناسب معلوم نہیں ہوا۔ اب تو شام نہیں رات ہو چکی ہے۔ ''کاشف بھائی۔'' میں نے کہا۔ ''کیا اس وقت جانا مناسب ہوگا۔''

''اس میں میرا قصور نہیں۔'' کاشف نے بتایا۔ ''میں نے پانچ بجے زبیر کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ آج چھ بجے کوئی اہم میٹنگ ہے جو رات

ساتھ آٹھ بجے ختم ہوگی۔ اب فون پر میں اس سے کیا کہتا' مجبوراً آٹھ بجے دوبارہ کال کی پتا چلا کہ میٹنگ جلدی ختم ہوگئی تھی۔ زبیر آفس سے جا چکا تھا۔ میں نے اس کے گھر فون کیا ملازم نے بتایا کہ صاحب کا فون آیا تھا۔ وہ نو بجے تک گھر پہنچیں گے چنانچہ میں سیدھا آپ کے پاس آگیا۔''

''مگر اس وقت۔''

''دیکھیے آپ جس مقام پر اس وقت کھڑی ہیں۔ اس میں اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ جو بات بگڑ گئی ہے۔ اسے بنایا جائے ورنہ کون جانے اس شہر غدار میں آپ کا کیا حال ہو۔ اب آپ مناسب اور غیر مناسب کی فکر میں پڑ گئیں۔ تو ہمیشہ کے لیے ہاتھ ملتی رہ جائیں گی۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے ہچکچاہٹ کا اظہار کیا تو وہ برا بھی مان سکتا ہے۔

''اچھی بات ہے چلیے۔'' میں کھڑی ہوگئی۔

کاشف اپنی کار میں آیا تھا۔ یہ ایک سیکنڈ ہینڈ ٹویاٹا تھی اور کاشف کے بقول اس نے اسے کوڑیوں میں خرید کر ہزاروں کا بنالیا تھا۔ راستے میں اس نے مجھے زبیر کے بارے میں بتایا کہ بہت دولت مند آدمی ہے لاکھ دو لاکھ تو اس کے لیے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتے' بیوی بچے دوسرے شہر میں رہتے ہیں اور اس نے یہ بنگلا بہت بڑی رقم میں صرف اپنی رہائش کے لیے خریدا ہے۔ جہاں ایک مالی' ایک باورچی' ایک گھریلو ملازم اور ایک چوکیدار کے ساتھ اکیلا رہتا ہے۔ من موجی آدمی ہے۔ خوش ہو تو کسی کے لیے لاکھوں بھی لٹا سکتا ہے اور جی نہ چاہے تو اس کی جیب سے ایک روپیہ بھی نکلوانا مشکل ہے۔ کاشف نے مجھے کچھ مشورے بھی دیے کہ میں جلدی اور نا سمجھی میں بات بگاڑنے کی کوشش نہ کروں۔ زبیر کو اپنے ڈھنگ سے سوالات کرنے اور حالات کا جائزہ لینے کا موقع دوں۔ اس کی عقل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو پھر وہ نوید کو میرے سامنے ناک رگڑنے پر بھی مجبور کرسکتا ہے۔

تقریباً ساڑھے نو بجے کاشف نے جس بنگلے کے پورچ میں کار روکی' وہ واقعی بہت خوب صورت اور شاندار معلوم ہوتا تھا۔ ایک ملازم نے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا پوچھنے پر اس نے بتایا کہ صاحب اسٹڈی روم میں بیٹھے کچھ فائلیں دیکھ رہے ہیں۔ کاشف مجھے اپنے ساتھ لیے کئی کمروں سے گزرتا ایک دروازے پر رک گیا۔ دستک دی۔ جواب میں جس شخص نے دروازہ کھولا۔ اسے دیکھ کر میری طبیعت نے کوئی اچھا تاثر قبول نہیں کیا۔

وہ ایک گرانڈیل آدمی تھا۔ چہرے کے خدوخال بحیثیت مجموعی برے نہیں تھے۔ مگر ان سے سختی کا تاثر ملتا تھا۔ اس نے دلچسپی سے میری طرف دیکھا۔ کاشف نے میرا تعارف کرایا۔ مگر میرے نام سے کسی رشتے سے نہیں۔ اس وقت میں گردوپیش کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس لیے اس بات پر توجہ نہیں دے سکی' زبیر نے ہمیں اندر آنے کی دعوت دی۔ یہ کمرہ جسے اسٹڈی روم کہا گیا تھا۔ صرف ایک الماری اور ایک میز اور چند کرسیوں کی حد تک تو ضرور ایسا ہی لگتا تھا۔ ورنہ باقی کمرے کی آرائش اسے بیڈروم ظاہر کر رہی تھی۔ کیونکہ وارڈ روب اور سنگھار میز بھی تھیں۔ ایک ڈبل بیڈ بھی کمرے کے دوسرے گوشے میں موجود تھا۔

ابھی ابتدائی رسمی فقروں کا تبادلہ ہی ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی زبیر نے ریسیور اٹھایا۔ سنتا رہا اور پھر ریسیور کاشف کی طرف بڑھا دیا۔

''تمہارا فون ہے۔''

''میرا۔'' کاشف چونکا۔ ''مجھے یہاں فون

کون کرسکتا ہے۔''

''شاید تمہاری بیگم ہیں۔'' زبیر مسکرایا۔

''بیگم۔'' کاشف گھبرا کر بولا۔ ''مارے گئے۔ میں بالکل ہی بھول گیا۔ آج اس کا بھائی آرہا ہے۔ مجھے بیگم کو ساتھ لے کر اسے ریسیو کرنے ایئرپورٹ جانا تھا۔''

اس نے پہلے رسٹ واچ پر ایک نظر ڈالی اور پھر میری طرف دیکھا۔

''صبا' تم اطمینان سے اپنی داستان زبیر بھائی کو سنادو۔'' وہ بولا۔

''میں بیگم کو ایئرپورٹ چھوڑ کر ابھی واپس آتا ہوں۔ فلائیٹ کا انتظار نہیں کروں گا۔ وہ لوگ ٹیکسی کرکے بھی گھر پہنچ سکتے ہیں۔''

''آپ ان سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ٹیکسی لے کر ایئرپورٹ چلی جائیں۔'' میں تنہا رہ جانے کے خیال سے گھبرا گئی۔

''کہہ سکتا ہوں۔'' کاشف نے جواب دیا۔ ''مگر عورتوں کی منطق کو آپ بہتر سمجھ سکتی ہیں۔ میں نے بیگم سے انہیں ایئرپورٹ لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب چاہے میں انہیں ٹیکسی ہی میں لے جاؤں۔ مگر میرا جانا ضروری ہے۔ میں یقیناً یہ نہیں چاہوں گا کہ دوسرے گھر کی آگ بجھانے سے پہلے میرا اپنا گھر جل جائے۔ کیا آپ یہ پسند کریں گی۔''

اب میں کیا جواب دیتی۔ کاشف ایک بار پھر جلد از جلد واپس آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔

''یہ کاشف گھر کی آگ کی کیا بات کر رہا تھا۔'' اس کے جانے کے بعد زبیر نے پوچھا۔

''میرے اور نوید صاحب کے درمیان کچھ جھگڑا ہوگیا ہے۔'' میں نے محتاط انداز میں کہنا شروع کیا مگر اتنا ہی کہہ سکی۔

''کون نوید۔'' زبیر نے میری بات کاٹ دی۔

''آپ کے دوست' بزنس پارٹنر اور کون۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''کیا آپ ایک بڑے بزنس مین نہیں ہیں اور آپ نے نوید صاحب کے ساتھ مل کر کوئی نیا کام شروع نہیں کیا ہے۔''

''میں بلاشبہ بزنس مین ہوں اور یہ بھی سچ ہے کہ لاکھوں کا کاروبار کرتا ہوں۔ مگر تنہا میں کسی کو پارٹنر نہیں بناتا۔ میں نوید نامی کسی شخص کو نہیں جانتا۔''

''مگر کاشف نے تو۔''

''ہاں ..... کاشف صاحب۔'' زبیر عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ''وہ اپنا کام نکالنے کے لیے ہر بات کہہ سکتا ہے۔ مگر مجھے نہیں معلوم آپ کون ہے اور اس سے آپ کا کیا تعلق ہے۔ مگر آپ کو لانے کے لیے اس نے مجھ سے ایک بڑی رقم وصول کی ہے۔''

میں سنانے میں آگئی۔ یا خدا کیا اس دنیا میں اب کسی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہر خوب صورت چہرے کے پیچھے کوئی مکروہ شیطان چھپا بیٹھا ہے۔ چند لمحوں میں میرا جسم پسینہ پسینہ ہوچکا تھا۔ کچھ حواس ٹھکانے آئے تو میں نے زبیر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے کہ کاشف مجھے یہاں یہ کہہ کر چھوڑ گیا ہے کہ میرے اور میرے شوہر نوید کے درمیان جھگڑا ہوا ہے اور اسے آپ ملے کرا سکتے ہیں کیونکہ نوید آپ کا بزنس پارٹنر ہے اور آپ کی بات نہیں ٹال سکتا۔

لیکن ظاہر تھا کہ جو شخص انسانیت کو بھی قابل فروخت شے سمجھتا ہو۔ اس پر میری باتوں کا کیا اثر ہوتا۔ زبیر نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس نے ایک بڑی رقم خرچ کی ہے۔ سودا کیا ہے۔ خیرات نہیں دی۔ اس کے ملازمین اس کے وفادار ہیں۔ نہ بھی ہوتے تو وہ اس بنگلے میں موجود نہیں ہیں اور بنگلے کا یہ کمرہ ساؤنڈ پروف ہے۔ میں کتنا ہی چیخوں چلاؤں کوئی میری مدد کو نہیں آئے گا البتہ اگر میں نے اس کے سودے کو خوش اسلوبی سے پاسداری کی تو وہ خوش ہو کر

مجھے بھی بہت بڑی رقم ادا کر سکتا ہے۔

مگر میں اپنے مقام سے اتنا گری نہیں تھی کہ اس کی کتنی ہی بڑی رقم مجھے مزاحمت سے روک سکتی۔ پھر بھی میں ایک کمزور لڑکی تھی اور زبیر جیسا کہ میں بتا چکی ہوں۔ ایک طاقتور گرانڈیل آدمی تھا۔ یقیناً اگر خدا کی رحمت میری مدد کو نہ پہنچ جاتی تو میں اس سے پیش نہیں پا سکتی تھی۔ میں حتی الامکان اس کی دسترس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر داخل ہوا جو کسی بھی طرح زبیر کا ملازم نہیں لگتا تھا۔ اس کا لباس قیمتی اور شخصی وجاہت بلکہ اس سے بھی زیادہ وہ ردعمل جو اسے دیکھ کر زبیر نے ظاہر کیا تھا۔ خود اسے بھی کوئی بڑا آدمی ظاہر کر رہا تھا۔

''آپ..... آپ جاوید صاحب! آپ اس وقت کیسے تشریف لائے۔'' زبیر ہکلایا۔

دوسری طرف دوڑ کر میں نے اس شخص کے پاؤں پکڑ لیے۔

''خدا کے لیے مجھے اس شیطان سے بچائیے۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

اس شخص نے جسے زبیر نے جاوید کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ ایک نظر میں کمرے کی بگڑی ہوئی حالت کا جائزہ لیا۔ میری طرف دیکھا اور پھر زبیر کی جانب۔

''میرے ساتھ آئیے خاتون!'' اس نے جھک کر میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

زبیر حیران اور سراسیمہ سا کھڑا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میں اور جاوید صاحب دروازے تک پہنچ گئے تو جیسے اسے ہوش آیا۔ ''سنیے جاوید صاحب۔''

''اب کہنے سننے کو کچھ باقی نہیں رہا۔ مسٹر زبیر!'' جاوید صاحب نے جواب دیا۔ ''میں تمہارے ہی کہنے کے مطابق تم سے چند نظر کاروباری معاملات پر گفتگو کرنے آیا تھا اور مجھے خوشی ہے کہ بہت مناسب وقت پر آیا کہ تم اندر سے کیا ہو یہ بھی دیکھنے کا موقع مل گیا۔ میرا نظریہ ہے کہ جو آدمی اپنی ذاتی زندگی میں اخلاق، تہذیب اور شرافت کی دھجیاں اڑاتا ہوا۔ وہ کاروبار میں بھی کبھی دیانت داری نہیں ہو سکتا۔ میرا اور تمہارا اب کوئی سودا نہیں ہوگا۔ مسٹر زبیرا! خدا حافظ۔''

میں جاوید صاحب کے ساتھ اس شیطان کے بنگلے سے باہر آ گئی اور زبیر اور اس کے ملازم (اگر وہ موجود تھے) ہمیں روکنے کی ہمت نہیں کر سکے۔ پورچ میں جاوید صاحب کی شاندار کار کھڑی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر میرے لیے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور میں خاموشی سے اندر بیٹھ گئی اگلی سیٹ پر بیٹھ کر انہوں نے کار اسٹارٹ کی اور اگلے لمحے ہم گیٹ سے باہر نکل رہے تھے۔ جب ہم بنگلے سے کافی دور ایک پر رونق سڑک سے گزر رہے تھے تو جاوید صاحب نے سائڈ میں کار روک دی۔

''خاتون! اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ آؤں۔'' وہ بولے۔ ''اور اگر خود جانا پسند کریں تو یہاں' یا جہاں کہیں اتار دوں۔''

''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا اور ایک بار پھر میری آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ ''جو تھا' اسے اپنی حماقت سے چھوڑ آئی اور جس گھر کو بنانے کی کوشش کی تھی۔ اسے ایک ظالم نے برباد کر دیا۔''

''اس صورت میں اگر آپ کو مجھ پر اعتبار ہو تو میرے گھر چلیں۔ آپ کی مدد کے لیے مجھ سے جو کچھ ممکن ہوا ضرور کروں گا۔''

''میرے ساتھ جو پے در پے واقعات پیش آ رہے ہیں۔ انہوں نے انسانیت پر سے میرا اعتماد کو ڈگمگا دیا ہے۔'' میں نے آنسو پونچھتے

''کہیں کسی پر اعتبار کروں کسی پر نہ کروں۔''

''آپ نے سچ کہا۔ اس زمانے میں آدمی کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ مگر اتنا تو آپ بھی جانتی ہوں گی کہ ہر انسان شریف نہیں ہوتا۔ تو بدمعاش بھی نہیں ہوتا۔ یوں بھی اس وقت رات ہیں۔ اگر آپ کا کوئی گھر نہیں ہے تو آپ کہاں جائیں گی۔''

میں اس گھر میں جا سکتی تھی۔ جہاں سے روانہ ہوئی تھی۔ مگر مجھے خوف تھا کہ زبیر یا کاشف وہاں مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اس وقت مجھے کسی شریف انسان کی پناہ کی ضرورت تھی اور میرا دل کہہ رہا تھا کہ جاوید صاحب' نوید کاشف' یا زبیر نہیں ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کے گھر چلنے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ پھر آگے بڑھ گئی۔

☆☆

جاوید صاحب کا پورا نام مرزا جاوید احمد تھا۔ ایک درمیانے درجے کے علاقے میں ایک خوب صورت مکان میں تقریباً اکیلے رہتے تھے۔ تقریباً اس لیے کہ ان کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ بہن بھائی تھے لیکن ان میں سے کچھ انگلینڈ میں اور کچھ کینیڈا میں آباد تھے۔ بہت دور کے رشتے سے ایک پھوپی تھیں۔ جو ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ مگر وہ بھی ان دنوں انگلینڈ گئی ہوئی تھیں۔ جاوید صاحب امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتے تھے۔ زبیر سے جس سودے کی بات کرنے گئے تھے۔ کاروں کی ایک بڑے شپمنٹ تھی۔ جس کا لائسنس اتفاق سے انہیں مل گیا تھا اور چونکہ اس زمانے میں کاروں کی درآمد و بیش بند تھی۔ اس لیے مقامی مارکیٹ میں بہت سے لوگ اس شپمنٹ کو خریدنا چاہتے تھے۔ میں نے ان کے گھر پہنچ کر دیکھا کہ کافی متمول ہونے کے باوجود وہ بہت سادہ زندگی گزارنے کے

ایک گھر میں کام کرنے اور کھانا پکانے والی ملازمہ اور دوسرا چوکیدار۔

گھر پہنچ کر جاوید صاحب نے مجھے پہلے منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھانے پینے کا مشورہ دیا۔ (وہ خود کھانا کھا چکے تھے) جسے میں نے قبول کر لیا۔ کیونکہ میں دوپہر کا کھانا کھائے ہوئے تھی اور وہ بھی کچھ ٹھیک سے نہیں کھایا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر جب ملازمہ برتن لے کر چلی گئی۔ تب جاوید صاحب نے مجھ سے کہا۔ کہ اگر میں انہیں اپنے حالات کے بارے میں بتاؤں تو شاید وہ زیادہ بہتر انداز میں میری مدد کر سکیں گے۔ مجھے بہر حال ایک ہمدرد اور حقیقی غمگسار کی ضرورت تھی اور اتنی دیر میں جاوید صاحب کا طرز عمل دیکھ کر میرے دل میں ان کے لیے بڑی اچھی رائے قائم ہو چکی تھی۔

میں نے انہیں شروع سے آخر تک تمام واقعات بلا کم و کاست کہہ سنائے' صرف اتنی احتیاط کی کہ اپنا نام بتانے کے علاوہ کسی اور کا نام نہیں بتایا۔ نہ والدین کا نہ شہر کا نہ نوید کا' نہ کاشف کا۔ جاوید صاحب نے بڑی ہمدردی سے میری داستان سنی خود اپنی طرف سے کوئی سوال نہیں کیا اور جیسا کہ میرا خیال تھا۔ میری بات پوری ہو جانے کے بعد کوئی تنقید بھی نہیں کی آخر میں صرف اتنا بولے کہ رات بہت ہو چکی ہے۔ آپ اب آرام کریں۔ اس گھر کو اپنا گھر خیال کرتے ہوئے۔ پورے اطمینان سے رہیں۔ آئندہ کے بارے میں خود بھی سوچیں اور مجھے بھی کچھ غور کرنے دیں۔ پھر مناسب وقت آنے پر مستقبل کا لائحہ عمل پر بات کریں گے دوسرے دن میں ان کے ساتھ گئی اور اس گھر سے اپنی تمام چیزیں لے آئی۔ ہمسایوں سے میں نے اپنے اور نوید کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ صرف اتنا کہا کہ ہمیں ایک دوسرا اچھا اور اپنی

ضرورت کے مطابق گھر مل گیا ہے۔ اس لیے وہاں جا رہے ہیں۔

اس طرح مجھے جاوید صاحب کے گھر رہتے ہوئے کم و بیش ایک ماہ گزر گیا۔ اس دوران انہوں نے مجھ سے غیر ضروری طور پر بات کرنے یا بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یوں بھی وہ بہت مصروف رہتے تھے۔ صبح نو بجے گھر سے نکلتے تھے تو پھر شام کو مغرب کے بعد اور کبھی کبھی تو عشاء کے وقت واپس آتے تھے۔ ان کے یہاں رات کے کھانے کا وقت نو بجے تھا۔ جو جاڑوں' گرمیوں' میں ہمیشہ ایک سا رہتا تھا اور نو بجے تک جاوید صاحب لامحالہ واپس آ جاتے تھے۔ اس لیے ہم صرف رات کے کھانے پر ہی اکٹھے ہوتے تھے۔ اس وقت بھی بس ادھر ادھر کی رسمی باتیں ہی ہوا کرتی تھیں۔ جاوید صاحب کے معمولات میں کوئی دن چھٹی کا دن نہیں تھا۔ ہفتہ وار چھٹی اتوار کو ہوا کرتی تھی اور وہ اتوار کو بھی اپنے دفتر جاتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے یونہی پوچھ لیا تو جواب دیا کہ میں چھٹی کے دن پورے ہفتے کے کام کا جائزہ لینے اور اور گزرے ہوئے ہفتے میں آفس کے اندر جو بے ترتیبی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے درست کرنے جاتا ہوں۔

مجھے ان کے گھر آئے ہوئے چوتھا ہفتہ گزر رہا تھا کہ ایک رات کھانے پر پہلی مرتبہ آئندہ کے بارے میں سنجیدگی سے گفتگو ہوئی۔ میں اس گفتگو کی تفصیل میں نہیں جاؤں گی۔ مختصراً اتنا کہنا کافی ہے۔ جاوید صاحب نے مجھے شادی کی پیش کش کی جسے میں نے کسی تامل کے بغیر منظور کر لیا۔ اس پر بھی ان کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ فوراً شادی کر لینے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک دوسرے کو جاننے کے لیے ایک ماہ کچھ بڑی مدت نہیں اور جبکہ ایک بار انتخاب میں غلطی ہو چکی ہو تو دوسرا قدم مجھے بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے۔ اس لیے ہم سر دست اپنی انگیجمنٹ کا اعلان کریں گے۔ ان کی پھوپھی دو تین ماہ کے بعد کینیڈا ہوتے ہوئے واپس آئیں گی۔ اس دوران اگر کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی تو ان کے آنے پر شادی کر لیں گے۔

ان کے خیال میں منگنی کی ضرورت ہی اس لیے تھی کہ ان کے گھر میں کوئی رشتہ قائم کیے بغیر میرا رہنا دوسری زبانوں کو غیر ضروری افواہیں پھیلانے کا' موقع دے سکتا تھا۔ نیز میرا ہر وقت گھر میں بند رہنا بھی مناسب نہیں تھا۔ منگنی ہو جانے پر البتہ اتنا تعلق تو قائم ہو ہی جائے گا کہ میں ان کے ساتھ کہیں باہر سیر و تفریح کے لیے جا سکوں۔

منگنی کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ وہ اس تقریب کو سادگی کے باوجود پروقار انداز میں منانا چاہتے ہیں۔ اس لیے چھوٹے پیمانے پر ایک پارٹی ہوگی جس میں ان کے دوست اور کاروباری ساتھی ہی مدعو کیے جائیں گے۔

☆☆

ایک ہفتے بعد منگنی کی تاریخ رکھی گئی۔ جس کے لیے کارڈ بھی چھپے اور تقسیم ہوئے۔ پارٹی کا انتظام مکان کے خاصے کشادہ لان میں کیا گیا تھا۔ اس تقریب کی مناسبت سے میرے لیے ضروری ملبوسات اور زیورات بھی خریدے گئے۔ میں بہت خوش تھی کہ تقدیر بگڑے بگڑے ایک بار پھر بن گئی تھی۔ قدرت نے میری غلطی کو کوئی بڑی یا طویل سزا نہیں دی۔ ایک ٹھوکر کھانے کے بعد ہی سنبھل گئی اور اب حالات ایسے نظر آتے ہیں کہ والدین کے گھر سے قدم نکالتے ہوئے میں نے جو خواب دیکھا تھا۔ وہ بہرحال پورا ہو جائے گا۔

دعوت میں کم و بیش سو مہمان مدعو کیے گئے۔ جاوید صاحب وقت کے معاملے میں بڑی پابندی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ان کے تمام دوست بھی یقیناً اس عادت سے واقف ہوں گے کہ ٹھیک

آٹھ بجے سے مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لان میں شامیانے لگا کر اسے مناسب انداز میں سجا دیا گیا تھا۔ میں اور جاوید صاحب سوا آٹھ بجے شامیانے کے دروازے پر کھڑے ہو گئے اور آنے والے مہمانوں کا استقبال کرنے لگے۔ میں بڑی مسرت کے ساتھ ہر آنے والے سے مل رہی تھی۔ جاوید صاحب ہر ایک کا تعارف بھی کراتے چلے جا رہے تھے۔

اچانک میں نے نوید اور کاشف کو آتے دیکھا۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔ گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ مگر اس مصیبت سے بچنے کی کوئی راہ نظر نہیں آئی۔ اگر کچھ پہلے نظر پڑ جاتی تو شاید میں بہانہ بنا کر گھر میں چلی جاتی۔ مگر میں نے ان دونوں کو اس وقت دیکھا۔ جبکہ درمیانی فاصلہ چند قدم رہ گیا تھا۔

دوسری طرف نوید اور کاشف بھی یقیناً مجھے دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔ بلکہ کاشف کے انداز سے تو ایسا شبہ ہوا جیسے وہ پلٹ کر بھاگنے والا ہے۔ نوید کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اسی وقت' جاوید صاحب نے بھی ان دونوں کو دیکھ لیا۔ شاید کاشف ان کے لیے اجنبی تھا کہ وہ ایک قدم بڑھا کر نوید سے مخاطب ہوئے۔

''آئیے۔ نوید صاحب تشریف لائیے۔ آپ کے والد صاحب نہیں آئے۔''

''جی ان کی کچھ طبیعت خراب تھی۔'' نوید نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں ان کی جگہ اپنے دوست کاشف صاحب کو لے آیا ہوں۔ بشرطیکہ آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔''

''اعتراض کیا ہوگا۔'' جاوید صاحب نے ہاتھ ملاتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کے دوست میرے دشمن تو نہیں ہو سکتے۔ بہرحال ان سے ملیے یہ میری منگیتر صباء ہیں۔''

وہ میری طرف گھومے میں نے بھی کسی نہ کسی حد تک خود پر قابو پا لیا تھا۔ مگر شاید پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ ''اور صباء! یہ شہر کے ایک معروف صنعت کار نذیر صاحب کے صاحب زادے' نوید صاحب ہیں۔ میں بزنس پارٹنر شپ پسند نہیں کرتا۔ مگر نذیر صاحب کے اصرار پر میں اور نوید صاحب ایک بزنس پروجیکٹ پر غور کر رہے ہیں۔''

تعارف کراتے ہوئے جاوید صاحب نے میرا چہرہ دیکھا تو چونکے۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' انہوں نے جلدی سے پوچھا۔

''مم...... مم...... میرا سر چکرا رہا ہے۔'' میں کنپٹیاں دباتے ہوئے بولی۔

''آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔'' جاوید صاحب نے کہا اور نوید کی طرف دیکھا۔

''پلیز آپ لوگ تشریف رکھیے میں ابھی حاضر ہوا۔''

وہ مجھے میرے کمرے میں لے گئے۔ میں پلنگ پر بے سدھ سی ہو کر گر پڑی۔ جاوید صاحب نے ملازمہ کو...... جس کا نام رجو تھا۔ ایک گلاس گلوکوز لانے کی ہدایت کی۔ رجو فوراً ایک گلاس ٹھنڈے پانی میں گلوکوز ڈال کر لے آئی میں نے گلوکوز پیا تو کچھ طبیعت ٹھہری۔

''آپ یہاں آرام کریں۔'' جاوید صاحب نے ہمدردی سے کہا۔ ''کھانا شروع ہونے میں ابھی کم از کم نصف گھنٹہ باقی ہے۔ خدا نے چاہا تو پندرہ بیس منٹ میں آپ کی طبیعت سنبھل جائے گی۔ پھر میں خود آ کر آپ کو لے جاؤں گا۔''

وہ رجو کو میرا خیال رکھنے کی ہدایت کر کے مہمانوں میں واپس چلے گئے۔ میں نے رجو کو کمرے سے باہر بھیج دیا۔ میں چند منٹ کے لیے بالکل تنہائی میں اس تازہ افتاد پر غور کرنا چاہتی

تھی۔ مجھے اس کا خوف نہیں تھا کہ نوید یا کاشف جاوید صاحب کو میرے بارے میں بتا دیں گے کیونکہ تمام باتیں میں خود انہیں بتا چکی تھی دل صرف اس خیال سے لرز رہا تھا کہ کہیں وہ یہاں بھی اپنی بدقماشی کا مظاہرہ نہ کریں اور کچھ نہ سہی تو مہمانوں کو ہی کچی جھوٹی باتیں بتا سکتے تھے۔ میں اس کا کچھ تدارک کرنا چاہتی تھی۔ مگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ سوائے اس کے کہ میں جاوید صاحب! کو بلا کر انہیں نوید اور کاشف کے بارے میں بھی بتا دوں اور ان سے کہوں کہ وہ ان دونوں کو یہاں سے چلتا کر دیں۔

میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کمرے میں قدموں کی آہٹ ابھری میں آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ آہٹ سن کر آنکھیں کھولیں۔ کاشف میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو۔'' میں نے کچھ بگڑ کر کہا۔

''بڑے غضب کی عورت ہو۔'' وہ بولا۔ ''میں یہ تو پھر کبھی پوچھوں گا کہ تم زبیر کے گھر سے ایک ہی جست میں یہاں کیسے پہنچ گئیں۔ اس وقت صرف تم کو خبردار کرنا ہے کہ اگر تم نے جاوید صاحب کو نوید کے یا میرے بارے میں کچھ بتایا تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔''

''تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' میں نے بڑے حوصلے سے جواب دیا۔ ''میں جاوید صاحب کو ضرور تمہارا اصلی چہرہ دکھاؤں گی۔''

''یہ بڑی ضدی اور ناسمجھ عورت ہے۔'' نوید نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا اور جاوید صاحب کا مشترکہ بزنس پروجیکٹ بہت بڑا کاروباری منصوبہ ہے۔ میں اسے کسی قیمت پر خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ اس عورت کا انتظام کرنا ہی پڑے گا۔ ذرا باہر آؤ۔''

وہ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ کھلی کھڑکی سے میں نے دیکھا کہ وہ راہداری میں کھڑے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ رجو ادھر سے گزری تو انہوں نے اسے بھی بلا لیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ ان سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ان سے یا تو پہلے سے واقف ہے یا اسے انہوں نے بعد میں اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ کاشف کو میرے کمرے تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میرا دل گھبرا رہا تھا۔

خدا جانے وہ کیا سازش کر رہے تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں دوسرے دروازے سے نکل کر لان پہ چلی جاؤں کہ وہ تینوں کھڑکی کے سامنے سے غائب ہو گئے۔ مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ اتنے مہمانوں کی موجودگی میں کوئی شرارت کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ مگر یہ میری خوش فہمی تھی' میں نے لان پر جانے کے لیے دوسرا دروازہ کھول لیا تھا۔ ادھر سے مہمانوں کی ملی جلی باتوں کے علاوہ تروتازہ ہوا کے جھونکے بھی آ رہے تھے۔ یہ ٹھنڈی ہوا مجھے بہت اچھی لگی' میں نے بھی پردے ایک طرف کر دیے اور وہیں دروازے کے سامنے کھڑی رہی۔

دفعتاً اپنے پیچھے پیروں کی چاپ سن کر میں گھومی۔ خیال جاوید صاحب کی طرف گیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں تھوڑی دیر بعد آ کر تمہیں لے جاؤں گا۔

مگر دروازے میں جاوید صاحب نہیں' نوید اور کاشف کھڑے تھے۔ کاشف کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ میں نے چاہا کہ میں لان کے دروازے سے باہر نکل جاؤں۔ مگر نوید نے ایک ہی جست میں مجھے پکڑ لیا۔ مجھے گھسیٹ کر کمرے میں بچھے ہوئے پلنگ کے قریب لایا۔ کاشف نے ریوالور میری کنپٹی سے لگا دیا۔

''تم خودکشی کر رہی ہو۔'' اس نے میرے

کان میں سرگوشی کی۔ ''تمہیں اپنی پچھلی زندگی پر بے حد شرمندگی تھی۔ تم خود کو جاوید صاحب جیسے شریف اور بلند کردار شخص کے قابل نہیں سمجھتی تھیں۔ ان سے انکار کرنے کا حوصلہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے تم نے یہ آسان راستہ اختیار کیا۔''

اور یہ کہتے ہوئے اس نے رائٹنگ پیڈ کا ایک صفحہ میری آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ یہ پیڈ جاوید صاحب استعمال کرتے تھے۔ صفحے پر صرف دو سطریں لکھی تھیں۔

''میں آپ جیسے انسان کے قابل نہیں تھی۔''

''مجھے معاف کر دیجیے' صباء۔''

''مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ جاوید صاحب تمہاری ہینڈ رائٹنگ سے واقف نہیں ہیں۔ وہ یا دوسرے لوگ اسے تحریر کے بارے میں شبہ نہیں کر سکتے۔'' کاشف میرے کان میں کہہ رہا تھا۔

میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ بلاشبہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اگر کمرے میں میری لاش کے ساتھ یہ خط پایا گیا تو جاوید صاحب یا کوئی اور بھی یہ تصور بھی کر سکے گا کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔

''تمہاری طبیعت کا اچانک خراب ہونا بھی اس سلسلے کی ایک کڑی تھا۔'' کاشف کی سرگوشی جاری تھی۔ اس لیے اب دل میں خدا کو یاد کرو اور مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

مگر اس سے پہلے کہ کاشف ٹرائیگر دباتا' ایک بارعب آواز کمرے میں گونجی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔ نوید۔'' ظاہر ہے وہ جاوید صاحب تھے۔ جو مجھے لینے آئے تھے۔ کاشف اس اچانک مداخلت پر بوکھلا گیا۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ دونوں پہلے سے اس بارے میں کچھ سوچ کر آئے تھے۔ ایک اضطراری حرکت کے طور پر کاشف نے مجھے زور سے پلنگ پر دھکا دیا۔ میں گر گئی۔ ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ گولی چلنے کی آواز سنی۔ گھبرا کر پلٹی تو جاوید صاحب گولی کھا کر گر رہے تھے یا تو کاشف کا نشانہ اتنا ہی خطرناک تھا یا تقدیر یونہی تھی کہ گولی ان کی پیشانی پر لگی تھی۔ میں ایک چیخ مار کر ان کی طرف جھپٹی اتنی ہی دیر میں نہ صرف جاوید صاحب کا چہرہ بلکہ سینہ بھی سرخ چپتے جاگتے خون سے بھر گیا تھا۔ میری آنکھوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ جھک کر انہیں دیکھا۔ مگر وہاں اب کیا تھا۔ اسی لمحے ذہن میں ایک دھماکا ہوا اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

☆☆

ہوش آیا تو سر پر پٹی بندھی تھی۔ سر کا پچھلا حصہ جیسے درد سے پھٹا جا رہا تھا اور میں پولیس کی حراست میں تھی۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ مجھے جاوید صاحب کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔ پولیس کو جو کہانی باور کرائی گئی تھی۔ وہ کچھ یوں تھی۔ کہ میں ایک آوارہ لڑکی ہوں۔ اپنے گھر سے کسی نوجوان کے ساتھ بھاگ آئی تھی۔ نوید اور کاشف میری بدکرداری سے واقف تھے۔ جاوید صاحب نے معلوم نہیں کن حالات میں مجھے اپنے گھر میں پناہ دی اور میں نے ان کی رحمدلی اور خداترسی سے فائدہ اٹھانے کے لیے کوئی ایسی دلگداز داستان بیان کی کہ وہ متاثر ہوئے اور مجھ سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ منگنی کی پارٹی اسی فیصلے کی ایک کڑی تھی۔ جاوید صاحب نے دعوت میں نوید اور کاشف کو بھی مدعو کیا۔ جو ان کے کاروباری ساتھی تھے۔ جب وہ دعوت میں آئے اور مجھے دیکھا تو بہت حیران ہوئی ان کے خیال میں مجھ جیسی خراب لڑکی جاوید صاحب جیسے شریف انسان کے لائق نہ تھی۔

چنانچہ انہوں نے جاوید صاحب سے میرا تمام کچا چٹھا بیان کر دیا۔ میری حقیقت سے واقف ہو کر قدرتی طور پر جاوید صاحب کو افسوس ہوا اور انہوں نے منگنی کا اعلان' بلکہ شادی کا

ارادہ بھی تبدیل کر دیا۔ دوسری طرف میں نے بھی نوید اور کاشف کو دیکھ لیا تھا اور سمجھ گئی تھی کہ اب میرا بھانڈہ پھوٹ جائے گا۔ چنانچہ میں طبیعت خراب کا بہانہ کر کے گھر میں آ گئی اور انتظار کرنے لگی کہ اب کیا ہوتا ہے۔ جاوید صاحب میرے کمرے میں آئے اور اپنے تازہ فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے یقیناً کچھ برا بھلا بھی کہا ہو گا۔ میں اپنی سازش ناکام ہوتے ہوئے دیکھ کر غصے میں پاگل ہو گئی۔ بھاگ کر جاوید صاحب کے کمرے میں گئی۔ وہاں سے ان کا ریوالور نکالا' واپس اپنے کمرے میں آئی اور ریوالور کے بل پر انہیں دھمکانے لگی کہ اسی وقت انہیں منگنی نہیں بلکہ شادی کرنا ہو گی ورنہ میں انہیں شوٹ کر دوں گی۔

ادھر جاوید صاحب کو گھر میں گئے کچھ دیر ہو گئی تو نوید اور کاشف انہیں تلاش کرتے ہوئے آئے۔ انہوں نے اپنے کانوں سے مجھے جاوید صاحب کو دھمکی دیتے سنا۔ جاوید صاحب دھمکیوں سے ڈرنے والے آدمی نہیں تھے ریوالور کو دیکھ کر بھی انہوں نے کوئی پرواہ نہیں کی اور بڑے سختی کے ساتھ مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا انکار سنتے ہی میں نے ان پر گولی چلا دی۔ جو ان کی پیشانی پر لگی اور وہ فوراً انتقال کر گئے۔

انچارج انسپکٹر نے بتایا کہ میرے خلاف قتل کی اتنی واضح اور عینی شہادتیں موجود ہیں کہ شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ گھر کی ملازمہ رجو نے مجھے جاوید صاحب سے لڑتے اور پھر بھاگ کر ان کے کمرے میں جاتے اور ریوالور لے کر واپس آتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ میرے پیچھے لپکتی ہوئی آ رہی تھی کہ نوید اور کاشف کو دیکھ کر رک گئی لیکن جب گولی چلنے کی آواز سنی تو بھاگ کر کمرے میں آ گئی۔ اس نے میرے ہاتھ میں ریوالور اور جاوید صاحب کو گولی کھا کر گرتے دیکھا' نوید اور کاشف اس سے بھی زیادہ عینی گواہ ہیں۔ جن کی آنکھوں کے سامنے میں نے جاوید صاحب کو شوٹ کیا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور تھا اور میں غصے کے اس پاگل پن میں کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اس لیے کاشف نے کمرے میں رکھا ہوا سنگ مرمر کا بھاری گلدان میرے سر پر مارا اور میں اس وار سے بیہوش ہو کر وہیں جاوید صاحب کی لاش کے پاس گر گئی۔

میں اپنے اس وقت کے جذبات و احساسات کی کیا کیفیت بیان کروں۔ تقدیر نے میرے ساتھ بڑا خوفناک مذاق کیا تھا۔ ایک طرف میرے خواب' تعبیر بنتے بنتے پھر اندھیروں میں ڈوب گئے دوسری طرف جاوید صاحب جیسے شریف' خدا ترس نیک دل انسان کو محض میری وجہ سے اپنی زندگی سے محروم ہونا پڑا اور تیسری طرف میری اپنی زندگی جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں محبوس نظر آنے لگی تھی۔ ظاہر ہے میں نے بڑی شدومد سے اس جرم سے انکار کیا۔ مگر میری مجبوری یہ تھی کہ اس وقت بھی اپنی پوری داستان نہیں سنا سکتی تھی۔

اتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد میں نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میرا چاہے جو حشر بھی ہو لیکن میں اپنے غریب والدین کو مزید ذلیل و رسوا نہیں کروں گی۔ ان کے لیے بدنامی کا یہ داغ ہی کافی تھا کہ ان کی نوجوان بیٹی گھر سے بھاگ گئی۔ اب اگر میں اپنے شہر کا نام یا اپنے والدین کا نام لیتی تو اخباری اطلاعات میرے گھر اور شہر تک پہنچتیں یا نہ پہنچتیں لیکن پولیس تفتیش کرتی ہوئی ضرور میرے ماں باپ کے گھر پہنچ جاتی۔ اسی طرح میں نوید کا نام بھی ظاہر نہیں کر سکتی تھی کہ بات پھر میرے والدین تک جاتی۔ میں نے صرف اتنا بیان دیا کہ بے شک میں ایک لڑکے کے ساتھ اس شہر میں آئی

تھی (کہاں سے اس کا جواب نہیں دیا۔) لڑکے نے مجھے دھوکہ دیا۔ چھوڑ کر چلا گیا۔

کاشف نے میری بے بسی سے فائدہ اٹھایا۔ ہمدرد بن کر مجھے زبیر کے ہاتھ فروخت کر دیا جہاں سے جاوید صاحب مجھے چھڑا کر لائے اور میری روداد سن کر اور پھر ایک دو ہفتے میں میرا طرز عمل دیکھ کر مجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ منگنی میں کاشف بھی آیا۔ اسے خطرہ ہوا کہ میں اس کے بارے میں جاوید صاحب کو نہ بتا دوں اس لیے اس نے مجھے رجو کی مدد سے ہلاک کرنا چاہا۔ اسی وقت جاوید صاحب آ گئے اور کاشف نے انہیں گولی مار دی۔

میرے اس بیان میں بے شمار جھول تھے۔ جرح کے بہت سے سوالات کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ پولیس کو شاید اتنا آسان مقدمہ برسوں سے نہیں ملا ہو گا۔ اس نے اپنی کارروائی مکمل کر کے مجھے عدالت میں پیش کر دیا۔

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو مجھ سے پوچھا گیا کہ میرا وکیل کون ہے' میں نے جواب دیا کہ میں اس شہر میں کسی کو نہیں جانتی' اور نہ ہی میرے پاس اتنے وسائل ہیں کہ میں کوئی وکیل کر سکوں۔ اس پر عدالت کی طرف سے ایک وکیل مسٹر رحمان کو میری پیروی کے لیے مقرر کیا گیا۔ رحمان صاحب جیل میں مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ خاصے وجیہہ اور پروقار نوجوان ہیں۔ عمر اٹھائیس انتیس سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ انہیں غور سے دیکھ کر میرے دل میں اندر سے اعتماد کا وہی جذبہ ابھرا جو جاوید صاحب کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔ وہ بھی گفتگو کا آغاز کرنے سے پہلے کچھ دیر تک مجھے غور سے دیکھتے رہے اور ان کی نظروں میں بھی میری سچائی یا غلط بیانی کو پرکھنے کے علاوہ کوئی تاثر نہیں تھا۔

''عدالت نے مجھے آپ کی پیروی کے لیے مقرر کیا ہے۔'' آخر انہوں نے کہا۔۔۔

''استغاثہ نے جو اپنی داستان ترتیب دی ہے۔ صرف اسی کو دیکھا جائے تو آپ کے جرم کا یقین آنے لگتا ہے لیکن میں اس نظریئے کا حامی ہوں کہ ایک مجرم کو بھی اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا پورا موقع ملنا چاہیے۔ اس نظریئے سے قطع نظر میں پورے خلوص سے آپ کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ میں نے پورے کھلے ذہن اور غیر جانبدارانہ طور پر آپ کا کیس ہاتھ میں لیا ہے۔ میرے دماغ میں آپ کے خلاف یا آپ کے حق میں کوئی خیال نہیں ہے لیکن اگر آپ بے گناہ ہیں تو یہ وقت ہے کہ آپ مجھ پر اعتماد کریں۔ الف سے ی تک پوری کہانی کوئی ذرا سی بات چھپائے بغیر مجھ سے بیان کر دیں۔ اگر مجھے یقین ہو گیا کہ آپ محض حالات اور لوگوں کے ظلم و ستم کا شکار ہو رہی ہیں تو میں آپ کی صفائی پیش کرنے میں جان لڑا دوں گا۔''

میں نے بڑی دیر تک رحمان صاحب کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور وہ بھی بڑے صبر و سکون سے مجھے سوچنے اور غور کرنے کا پورا موقع دینے کے لیے خاموش بیٹھے رہے جیسا کہ میں نے بتایا۔ رحمان صاحب! کے اندر بھی کوئی ایسی بات تھی جو مجھے ان پر اعتبار کرنے پر ابھار رہی تھی۔ آخر میں بولی۔

''آپ مانیں یا نہ مانیں مگر خدا بہتر جانتا ہے کہ میں بالکل بیگناہ ہوں یہ درست ہے کہ میں نے پولیس کو جو بیان دیا ہے۔ وہ تمام تر سچ نہیں ہے۔ مگر میں اس کے لیے مجبور تھی۔ مجھے اچھی طرح احساس ہو چکا ہے کہ میں نے والدین کی نافرمانی اور گھر سے بھاگ کر بہت بڑی غلطی کی ہے اور یہ احساس ہی مجھے مجبور کر رہا ہے کہ اب تک جو ذلت و رسوائی مقامی طور پر ان کی ہو چکی ہے۔ اسے ملک کے گوشے گوشے تک نہ پھیلاؤں۔ بے شک مجھے پھانسی کی سزا ہو جائے لیکن میں اپنی زبان نہیں کھولوں گی۔ آپ کو دیکھ

کر اعتبار کرنے کو جی چاہتا ہے اور فطری طور پر میری خواہش بھی ہے کہ ان افراد کے علاوہ جنہوں نے مجھے اس جرم میں پھانسا ہے۔ کوئی ایک تو شریف انسان ہو جو مجھے بے گناہ خیال کرے۔ اس لیے اگر آپ مجھ سے خدا کی قسم کھا کر وعدہ کریں کہ میں جو کچھ آپ کو بتاؤں گی وہ صرف آپ کی ذات تک رہے گا۔ آپ اسے کسی بھی انداز سے عدالت کی کارروائی میں شامل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے تب میں آپ کو اپنی داستان سنا سکتی ہوں۔''

رحمان صاحب چند لمحات تک سوچتے رہے۔

''میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔'' انہوں نے جیسے بدستور کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اور وعدہ کرتا ہوں کہ جو مقصد آپ کے پیش نظر ہے۔ میں اسے کسی بھی طرح نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کروں گا لیکن اتنی اجازت آپ کو دینا ہوگی کہ اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے۔ اگر صفائی کا کوئی پہلو میں آپ کی داستان سے نکال سکوں تو اس سے ضرور فائدہ اٹھاؤں۔''

''میں نے بہت سوچا ہے۔ رحمان صاحب۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن میں اپنی صفائی میں کوئی ثبوت اپنے والدین کو ملوث کیے بغیر پیش نہیں کر سکتی۔''

''آپ نے وکالت پڑھی ہے۔''

''جی نہیں۔''

''تب پھر یہ فیصلہ آپ مجھ پر کیوں نہیں چھوڑ دیتیں۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''آپ بھی کوشش کر کے دیکھ لیں۔''

اس کے بعد میں نے رحمان صاحب کو تمام حالات جب اور جس طرح پیش آئے تھے کہہ سنائے اور وہ بڑی توجہ سے سنتے رہے اور درمیان میں گاہے گاہے وضاحتی سوالات کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی نوٹ بک پر کچھ لکھتے بھی جا رہے تھے۔ جب میں خاموش ہوئی۔ تو وہ کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھے میرے بیان پر غور کرتے رہے۔

''آپ کی صفائی کو پیش کرنے کے لیے آپ کے شہر سے نورین کو بطور گواہ بلایا جا سکتا ہے۔ یہاں نوید کو سمن بھیجا جا سکتا ہے۔ جس مکان میں آپ کو رکھا گیا تھا اس کے مالک کو عدالت میں لیا جا سکتا ہے۔ اس محلے کے لوگوں کی گواہی بھی پیش کی جا سکتی ہے اور ان سب سے بڑی مدد ملے گی۔ مقدمے کا رنگ بھی پلٹ سکتا ہے لیکن پھر وہی بات کہ ایسا کرنے کے لیے آپ کے والدین کا نام زیر بحث آنا ضروری ہے۔ اور یہ ہی آپ نہیں چاہتیں۔''

''میں نے آپ سے کہا نا کہ جب مجھے کوئی صورت نظر نہیں آئی تب ہی میں نے پولیس کو اپنا موجودہ بیان دیا تھا۔'' میں پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔

''پھر بھی آپ پریشان اور مایوس نہ ہوں۔ میں مزید غور کروں گا۔ شاید کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ ہم رجو پر دباؤ ڈال کر اس کے منہ سے سچ اگلوا سکیں۔'' رحمان صاحب نے جواب دیا۔

مزید دو چار باتوں کے بعد وہ دوبارہ جلدی آنے کے لیے کہہ کر چلے گئے۔ انہوں نے عدالت سے مقدمے کی تیاری کرنے کے لیے مہلت مانگی تھی اور عدالت نے درخواست منظور کرتے ہوئے پیشی کی جو دوسری تاریخ مقرر کی تھی۔ اس میں ابھی کافی دن تھے۔ میں جیل میں اپنی کوٹھری میں واپس گئی تو پہلی مرتبہ میرے ذہن میں کچھ اور خیالات ابھر رہے تھے۔ رحمان صاحب نے رجو کا ذکر کیا تھا۔ اس کے نام کے ساتھ ہی کاشف اور نوید کا نام بھی ایک بار پھر

شدت کے ساتھ ذہن میں گونجنے لگا۔ نوید نے جو کچھ کیا تھا۔ وہ کیا تھا لیکن میری اس حالت کا تمام تر ذمے دار کاشف ہی تھا۔ اس نے ایک مجھے ذلت کے گڑھے میں دفن کرنے کی کوشش کی اور دوسری مرتبہ پھانسی کا پھندا میرے گلے میں ڈال دیا۔ میرے دل و دماغ میں اس سے انتقام لینے کی خواہش جنگل کی آگ کی طرح بھڑک گئی لیکن میں جیل میں تھی اور اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی۔

اور بالآخر سوچتے سوچتے میرے ذہن میں ایک انوکھی ترکیب آئی' بلاشبہ بنیادی غلطی اور گناہ میری تھی کہ میں نے گمراہی کے راستے پر قدم ہی کیوں اٹھایا لیکن میری کم فہم اور نا تجربے کار جذباتیت سے فائدہ اٹھانے اور پھانسی کے پھندے تک لانے والے نوید اور کاشف تھے۔ میں نے ایک ایسا تیر عمل کی کمان میں چڑھایا۔ جس سے میں ان دونوں کو شکار کر سکتی تھی۔ مقدمے کے کاغذات اور فائلوں میں' میں نوید اور کاشف دونوں کا پتہ دیکھ چکی تھی۔ میں نے رحمان صاحب سے ایک ملاقات کے دوران ایک بار کسی بہانے سے اسے دیکھا اور اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔

اس کے بعد ایک رات مجھے قے اور دل کا دورہ پڑا۔ جیل کے احکام گھبرا گئے کہ کہیں میں نے زہر تو نہیں کھا لیا۔ فوراً مجھے ایمبولینس کے ذریعے اسپتال بھیج دیا گیا۔ فوڈ پوائزنگ کا کیس تھا۔ میں نے جیل کا سالن سات آٹھ دن تک سڑانے کے بعد آنکھیں بند کر کے کسی کڑوی دوا کی طرح نگل لیا تھا۔ جلد ہی دواؤں اور انجکشنوں کے ذریعے میری بیماری پر قابو پا لیا گیا لیکن ایک حقیقی بیماری سے ایک دوسری فرضی بیماری پیدا کر لینا میرے لیے کچھ ایسا زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا۔ میں نے سینے میں دل کے مقام پر شدید درد کی شکایت بیان کرنا شروع کر دی۔ قدرتی طور پر اسپتال میں میرا قیام طویل ہو گیا۔

قے اور دستوں سے پیدا ہونے والی کمزوری چار پانچ دن میں جاتی رہی۔ اس دوران رحمان صاحب نے میرا ضرورت سے زیادہ خیال رکھا۔ ہر قسم کے پھل' بااکر معقول ناشتا اور کھانا مجھے مل رہا تھا۔ عجیب بات تھی تا کہ ایک وکیل اپنے موکل سے فیس وصول کرنے کے بجائے اس کے علاج معالجے کے اخراجات برداشت کر رہا تھا۔ میں نے ایک شام جب رحمان صاحب مجھ سے ملنے آئے تو ایک ہزار روپے نقد کی فرمائش کر کے اسے اور عجیب بنا دیا۔ مگر انہوں نے کوئی بھی سوال کیے بغیر مجھے پچاس روپے دے دیے۔

پولیس کے حکام یقیناً روزانہ ڈاکٹروں سے میری رپورٹ دریافت کرتے ہوں گے۔ ڈاکٹروں کی تشخیص جو کچھ بھی ہو لیکن میں چکر آنے' آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے اور دل کے مقام پر درد کی مسلسل شکایت بیان کر کر کے خود کو کافی کمزور ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ابتداء میں دن و رات نگرانی کی گئی۔ مگر پھر جو ایک کانسٹیبل رات کے وقت ڈیوٹی دینے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ اس نے کمرے کے باہر بچھی ہوئی بنچ پر سونا شروع کر دیا۔

رحمان صاحب سے ایک ہزار روپے وصول کرنے کی تیسری رات جب ڈاکٹر اور نرسیں اپنا آخری راؤنڈ لگا کر جا چکے تو میں تقریباً ساڑھے بارہ بجے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر کود گئی۔ جانے سے پہلے میں نے پلنگ پر تکیے اور کچھ دوسری چیزیں ملا کر چادر ڈال کر اس طرح کی شکل بنا دی تھی کہ کوئی جھانک کر دیکھے تو سرسری نظر میں یہ ہی معلوم ہو کہ میں چادر تانے سو رہی ہوں۔ میں یہ دیکھ چکی تھی کہ جس کمرے میں مجھے رکھا گیا ہے۔ وہ اسپتال کی عمارت کے عقبی حصے میں واقع ہے اور کمرے کی دیوار کے

ساتھ ہی ایک سائڈ اسٹریٹ موجود ہے۔ کھڑکی سے کود کر میں سڑک پر آ گئی۔ میں نے سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔ جس میں اسپتال کا ڈھیلا ڈھالا لباس بالکل چھپ گیا تھا۔
کچھ دور آگے جا کر مجھے ایک ٹیکسی مل گئی میں نے اسے روکا اور ڈرائیور کو پتا بتا کر اسے چلنے کو کہا۔ جمیل جن دنوں مجھے سیر و تفریح کے لیے لے جاتا تھا۔ میں نے اکثر علاقے ذہن نشین کر لیے تھے۔ خاص طور سے وہ علاقہ جہاں نوید کے دو تین دوستوں کے بنگلے واقع تھے۔ نوید نے مجھے کبھی یہ بات نہیں بتائی تھی کہ اس کا اپنا گھر بھی اس جگہ واقع ہے لیکن عدالت کے کاغذات دیکھنے کے بعد مجھے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ کہاں ہو سکتا ہے۔ میں مین روڈ پر ہی ٹیکسی سے اتر گئی۔ کرایہ ادا کیا چینج واپس لی اور ایک سائیڈ اسٹریٹ میں گھوم گئی۔
تقریباً دس منٹ پیدل چلنے کے بعد میں اپنی منزل کے سامنے کھڑی تھی۔ یہ بات مجھے رحمان صاحب ہی سے معلوم ہوئی تھی کہ نوید شادی شدہ تھا۔ بی اے پاس کرنے سے پہلے ہی اس کی شادی دور کے عزیزوں میں کر دی گئی تھی۔ مگر یہ شادی ایک سال بھی نہ چل سکی۔ نوید کی بیوی بھی ایک دولتمند باپ کی بیٹی تھی۔ وہ نوید کی آوارگی کیوں برداشت کرتی۔ اپنے والدین کے گھر چلی گئی اور خلع کا مقدمہ دائر کر دیا۔ جب نوید لورین کے گھر مجھے ملا تھا تو اسی مقدمے کی دو تین پیشیاں ہو چکی تھیں۔ گزشتہ دو ماہ میں بھی کوئی خاص پیشرفت نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر میرے بعد نوید نے دل بہلانے کے لیے کوئی اور کھلونا حاصل نہیں کر لیا تھا تو وہ اپنے مکان میں اکیلا ہی ہو گا۔ دوسرے کھلونے کی امید بہت ہی کم تھی۔ سر دست جو حالات تھے۔ ان میں یقیناً نوید ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھا رہا ہو گا۔ گیٹ بند تھا۔ مگر کسی قدر دشواری کے بعد میں چہار دیواری پھاند گئی اور اندر پہنچ کر پہلا کام یہ کیا کہ گیٹ کے کنڈی کھول دی۔ مختلف دروازوں کا جائزہ لیا تو ایک دروازہ کھلا مل گیا۔ جہاں تمام ذمے داری ملازموں پر ہو۔ وہاں ایسی کوتاہی کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد مجھے نوید کا کمرہ مل گیا۔ وہ اپنے شاندار بیڈ پر بے خبر سو رہا تھا۔ آج کی رات تقدیر بھی میرا ساتھ دے رہی تھی۔ کمرے میں رکھی ہوئی آہنی الماری کی ایک دراز میں مجھے وہ چیزیں بھی مل گئیں جو میرے منصوبے میں سب سے زیادہ اہم تھیں۔ یعنی ایک ریوالور' میں نے ایک ایک کر کے کمرے کی تمام بتیاں روشن کر دیں۔ ٹیلیفون نوید کے سرہانے رکھا ہوا تھا۔ ایک پردے کی ڈوری کھول کر میں نے اس سے نوید کے دونوں پیر باندھ دیے اور پھر ریوالور کی نال اس کے سینے پر مار کر اسے بیدار کیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو روشنی کی چکا چوند میں تیس چالیس سیکنڈ تک وہ مجھے نہیں پہچان سکا اور جب اچھی طرح پہچان لیا اور میرے ہاتھ میں ریوالور بھی دیکھ لیا تو اچھل کر خوفزدہ انداز میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔
اس کے بندھے ہوئے پیروں نے اسے زیادہ نقل و حرکت سے روک رکھا تھا۔
''تم..... تم' تم جیل سے باہر کیسے آئیں۔'' اس نے بوکھلا کر پوچھا۔
''ریسیور اٹھاؤ اور کاشف کو فون کرو۔''
میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ''اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ تم نے اور کاشف نے مجھے بربادی کے دہانے تک پہنچا دیا ہے۔ خون کا الزام مجھ پر لگ ہی چکا ہے۔ اس لیے مجھے تمہاری زندگی ختم کرنے کے لیے ٹرائیگر دبانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہو گی۔ میں اس مقام پر کھڑی ہوں۔ جہاں مجھے کسی بات کی کوئی پرواہ نہیں رہ گئی ہے۔''

نوید پر کسی خوفناک دھمکی کا بھی شاید اتنا اثر نہ ہوتا جتنا میری مختصر تقریر کا ہوا۔ اس لیے بڑی سعادتمندی سے ریسیور اٹھا کر کاشف کا نمبر ڈائل کیا۔ یہ ایک رسک تھا۔ جو بہر حال مجھے لینا پڑا۔ مگر مجھے تقریباً یقین تھا کہ وہ اس گھبرائی ہوئی ذہنی کیفیت میں کوئی چالاکی نہیں سوچ سکے گا اور کاشف ہی کو فون کرے گا۔ میرا اندازہ غلط نہیں نکلا۔
''اسے کوئی بھی بہانہ بنا کر اسی وقت اپنے گھر آنے کے لیے کہو۔'' میں نے دوسرا حکم دیا۔
نوید نے اس کی بھی تعمیل کی بہانہ بھی اچھا سوچا۔ بولا کچھ نیا مال آیا ہے جو اس کی ضرورت سے زیادہ ہے۔ کاشف چاہے تو اپنے دوستوں کو پیش کرنے کے لیے اس مال میں حصہ بنا سکتا ہے۔ بشرطیکہ فوری طور پر اس کے گھر آ جائے۔
''بہت خوب۔'' میں نے داد دی۔ ''یقیناً تم اپنے دوست کو اچھی طرح جانتے ہو اور سمجھتے ہو کہ صرف یہ ہی بات اسے گرم بستر سے باہر نکال سکتی تھی۔''
یہ میری اس سے آخری گفتگو تھی۔ یہ یقین کرنے کے بعد کہ کاشف اپنے گھر سے چل پڑا ہو گا۔ میں نے بغیر کسی احساس کے ٹرائیگر دبا دیا۔ اتنے قریب سے نشانہ خطا جانے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ گولی اس کے سر پر لگی اور وہ تھوڑا سا اچھلا اور پھر بستر پر بے حس و حرکت پڑا رہ گیا۔
میں نے اس کے پیر کھول دیے۔ ڈوری واپس پردے میں لگا دی۔ گھڑی دیکھی۔ کاشف کو اپنے گھر سے روانہ ہوئے سات منٹ ہو چکے تھے۔ وہ جہاں رہتا تھا۔ اس جگہ سے یہاں پہنچنے کے لیے جبکہ سڑکوں پر کوئی خاص ٹریفک بھی نہ ہو اسے بیس پچیس منٹ سے زیادہ نہیں لگ سکتے تھے۔ یہ دوسرا رسک تھا۔ جس سے بچنا ناگزیر تھا۔ اگر کاشف کی آمد اور پولیس کی آمد جس دفعے سے ہونا چاہیے تھی۔ نہ آتی تو میرا پورا منصوبہ ضائع ہو سکتا تھا۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ آج کی رات قدرتی عوامل بھی میرا ساتھ دے رہے ہیں۔
میں نے نوید کے کمرے کی بتیاں بجھا دیں۔ ریوالور رومال سے اچھی طرح صاف کر کے کمرے کے سامنے کوریڈور میں اس طرح ڈال دیا کہ نظر آئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ کمرے کا دروازہ آہستہ سے بھیڑ دیا۔ کوریڈور کی سب روشنیاں جلا دیں گھڑی دیکھی۔ مزید پانچ منٹ گزر چکے تھے۔ اپنی تلاش کے دوران میں ایک فون ڈرائنگ روم میں بھی دیکھ چکی تھی۔ چنانچہ وہاں پہنچی۔ رومال ہاتھ میں لپیٹ کر ریسیور اٹھایا اور قریبی پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کیا۔
''ہیلو پولیس اسٹیشن۔'' رابطہ قائم ہونے پر میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''براہ کرم فوراً کسی ذمے دار آفیسر کو بھیج دیں۔ اور پھر میں نے بنگلے کا ایڈریس نوٹ کروا دیا۔ یہاں بنگلے میں کسی کا فون ہو گیا ہے۔ میں نے ایک آدمی کو بنگلے سامنے کار سے اتر کر ہاتھ میں ریوالور لیے بھاگ کر اندر جاتے دیکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد فائر کی آواز سنائی دی۔ میں اس علاقے میں اجنبی ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا ہوں اور پھر اس سے پہلے کہ سننے والا کوئی سوال کرتا میں نے ریسیور رکھ دیا۔
میں ڈرائنگ روم سے باہر نکلی گھڑی دیکھی' مزید تین منٹ گزر چکے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق کاشف کو پہنچنے میں پانچ سے دس اور پولیس کو آنے میں دس سے پندرہ منٹ کا وقت لگ سکتا تھا۔
حالات کی سازگاری کا ایک اور اندازہ مجھے اس وقت ہوا تھا۔ جب میں الماری سے ریوالور نکال رہی تھی۔ سب سے نچلے حصے میں ایک بریف کیس رکھا ہوا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ

ضرور اس میں کوئی ضروری چیز ہوگی۔ ورنہ نوید اسے یوں الماری میں سنبھال کر نہ رکھتا۔ اس وقت میرے ذہن پر کوئی اور سوچ مسلط تھی۔ اس لیے میں نے اسے کھول کر نہیں دیکھا لیکن اب دوبارہ اس کا خیال آیا تو واپس اس کمرے میں گئی۔ بتی جلائی' بریف کیس نکالا اور ڈھکنا ذرا سا ہی کھولا تھا کہ جلدی سے بند کر دیا۔ یہ کاشف کے لیے ایک بہترین تحفہ بن سکتا تھا۔ میں نے اسے ڈبل بیڈ کے سرہانے رکھ دیا۔ بتی بجھائی اور دروازے کے پٹ بھیڑتے ہوئے باہر آ گئی۔

میرا کام پورا ہو چکا تھا۔ بنگلے سے نکل کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ دور فاصلے پر کسی کار کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ میں پھرتی سے سائیڈ اسٹریٹ میں گھوم گئی۔ دل تو چاہتا تھا کہ کاشف اور پولیس دونوں کو اپنی آنکھوں سے آتے دیکھوں مگر اب مزید ٹھہرنا خطرناک بھی ثابت ہوسکتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ پروردگارا میں جو کچھ کرسکتی تھی کر چکی اب اگر تیرا انصاف بھی میری تدبیر کا ہم نوا ثابت ہو تو مجھے اپنی بربادی کا کوئی غم نہیں ہوگا۔

ٹیکسی کے ذریعے اسپتال واپس آنا اور پھر اسی کھڑکی سے اپنے کمرے میں پہنچ جانا کوئی ایسا دشوار ثابت نہیں ہوا۔ میں ٹھیک سوا دو بجے اپنے بستر پر لیٹی ایک بار پھر کامیابی کی دعائیں کر رہی تھی۔

☆☆

ظاہر ہے میرے کمرے میں اخبار نہیں آتا تھا۔ مگر خبر ایسی گرما گرم تھی کہ رحمان صاحب نے یقیناً ٹھیک سے ناشتا بھی نہیں کیا ہوگا کہ وہ نو بجے میرے کمرے میں داخل ہوئے۔

"مجھے معلوم نہیں کہ اس واقعے کا آپ کے مقدمے پر کوئی اچھا اثر مرتب ہوگا یا نہیں۔" انہوں نے آتے ہی کہا۔ "لیکن قدرت نے ان ظالموں سے آپ کی بیگناہی کا انتقام ضرور لے لیا۔"

"آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔ کیا نوید اور کاشف کی۔" میں نے حیرت ظاہر کی۔

"جی ہاں۔"

"کیوں انہیں کیا ہوا۔"

"نوید قتل کر دیا گیا اور پولیس نے کاشف کو قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔"

"اچھا یہ کیسے ہوا۔"

"آپ خود دیکھ لیں۔" رحمان صاحب نے بغل میں دبا ہوا اخبار میری طرف بڑھا دیا۔

"خبر میں اطمینان سے پڑھ لوں گی۔" میں نے جواب دیا۔ "ابھی تو آپ کی زبان سے سننا چاہتی ہوں۔"

"کل رات ڈیڑھ بجے کسی نے پولیس اسٹیشن فون کیا۔ آواز سے کوئی اندازہ نہ ہوسکا کہ بولنے والا کوئی مرد ہے یا عورت۔ مگر بات مردوں کی طرح کر رہا تھا۔" اس نے بتایا۔

اور رحمان صاحب نے وہی سب کچھ دہرایا۔ جو میں پولیس سے کہہ چکی تھی۔ انہوں نے مزید بتایا کہ فون کال کے جواب میں جب پولیس اس جگہ پہنچی تو اس نے کاشف کو مقتول نوید کے کمرے میں اس حالت میں پایا کہ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا اور دوسرے میں ایک بریف کیس جس میں تقریباً دس لاکھ روپے نقد رکھے ہوئے تھے۔ نوید اپنے بستر پر مردہ خون میں نہایا ہوا پڑا تھا۔ کاشف اپنی بے گناہی کی قسمیں کھا رہا تھا۔ یہ کہہ رہا تھا کہ اسے خود نوید نے فون کرکے بلایا تھا۔ ریوالور اسے راہداری میں پڑا ملا اور بریف کیس پلنگ کے قریب ابھی وہ صورت حال کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ پولیس پہنچ گئی اور اسے گرفتار کر لیا۔

"ظاہر ہے کہ پولیس کو کاشف کے بیان پر بالکل اعتبار نہیں۔" آخر میں رحمان صاحب نے کہا۔ "اس کا نظریہ یہ ہے کہ نوید اور کاشف کسی غلط کاروبار میں شریک تھے۔ ورنہ نوید اسے رات کے ایک بجے کیوں بلاتا۔ کاشف طلبی کے جواب میں گھر پہنچا۔ وہاں رقم کی تقسیم پر ان کا جھگڑا ہوا اور کاشف نے خود نوید کے ریوالور سے ہی اسے شوٹ کر دیا۔"

"کوئی عینی گواہ ہے۔" میں نے پوچھا۔

"بس یہ ہی پولیس کے کیس کا کمزور پہلو ہے اور اسی لیے وہ بڑی تندہی سے اس فون کرنے والے کی تلاش میں ہے۔"

اب جبکہ نوید مر چکا ہے اور کاشف حوالات میں ہے۔ میرے مقدمے کا کیا بنے گا۔"

"پولیس کا ایک اہم گواہ مر چکا ہے اور دوسرے کی گواہی مشکوک ہو چکی ہے۔" رحمان صاحب نے جواب دیا۔ "صرف رجو باقی ہے مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اس صورت حال سے خوفزدہ ہوگی اور اسے خدا کا عذاب خیال کر رہی ہوگی۔ اگلی پیشی پر میں اس پر ایسی جرح کروں گا کہ وہ گھبرا کر نوید اور کاشف کی سازش کا بھانڈہ پھوڑ دے گی۔ اگر ایسا ہوگا تو پھر انشاء اللہ آپ کو باعزت بری کر دیا جائے گا۔"

☆☆

مگر اگلی پیشی اس سے کہیں زیادہ ڈرامائی ثابت ہوئی۔ جتنی کہ رحمان صاحب کی توقع تھی۔ رجو بہت سہمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ کاشف بھی پولیس کی حراست میں عدالت کے سامنے حاضر تھا۔ رحمان صاحب نے عدالت کی توجہ نوید کے قتل اور کاشف کی گرفتاری کی طرف دلاتے ہوئے کہا کہ انہیں یقین ہے کہ ان کی موکلہ بیگناہ ہے اور اسے اس جرم میں پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب اگر عدالت انہیں گواہ رجو سے چند سوالات کرنے کی اجازت دے دے تو انہیں پوری توقع ہے کہ مقدمے کا فیصلہ اسی پیشی میں ہو جائے گا۔

وکیل استغاثہ کے جوش و خروش کے غبارے کی ہوا ابھی نکل چکی تھی۔ انہوں نے نیم دلی سے اعتراض کیا۔ مگر جج صاحب نے جنہیں خود بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اعتراض مسترد کر دیا۔ رجو گواہوں کے کٹہرے میں آئی تو اس کے پیر کانپ رہے تھے اور ابھی رحمان صاحب نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ "رجو تم نے قدرت کا انصاف دیکھا۔" کہ رجو نے جج صاحب کی طرف منہ کرکے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ گڑگڑانے لگی کہ اسے معاف کر دیا جائے۔ اس نے روپے کے لالچ میں آ کر نہ صرف اپنے مالک سے غداری کی۔ بلکہ ایک بیگناہ پر جھوٹا الزام بھی عائد کیا۔ اس نے بتایا کہ نوید اور کاشف نے اسے پچاس ہزار روپے دیے تھے اور مزید چالیس ہزار دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ان کے کہنے پر ہی اس نے وہی کیا جو وہ کہلوانا چاہتے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ صباء صاحبہ بے گناہ ہیں۔ جاوید صاحب کو کاشف نے قتل کیا ہے۔"

یہ الفاظ سنتے ہی رحمان صاحب بڑے ڈرامائی انداز میں کاشف کی طرف گھوم گئے۔

"کیوں مسٹر کاشف! قتل کے اس دوہرے اقدام کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔ کیا اب بھی یہ ہی اصرار کرو گے کہ تم بے گناہ ہو۔" انہوں نے گرجدار آواز میں کہا اور کاشف اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے بے اختیار چیخ اٹھا۔

"بلاشبہ یہ میرے اعمال کا عذاب ہے۔ جو میرے سامنے آ رہا ہے۔" اس نے کہا۔ "مگر خدا کی قسم میں نے نوید کو قتل نہیں کیا۔"

"اور جاوید صاحب کو۔" رحمان صاحب نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔" کاشف سر جھکا کر بولا۔ "اس شریف انسان کا قاتل میں ہی ہوں۔"

عدالت میں ایک شور مچ گیا ملک کی تاریخ میں شاید ہی کسی قتل کے مقدمے کا ایسا ڈرامائی فیصلہ ہوا ہو۔ پانچ چھ منٹ بعد جب سکون ہو نے

پر دوبارہ کاروائی شروع ہوئی تو وکیل استغاثہ نے کھڑے ہوتے ہوئے عدالت کو بتایا کہ وہ مسماۃ صباء کے خلاف اس مقدمے کو واپس لینے کی درخواست کرتے ہیں تاکہ اصلی مجرم کاشف کے خلاف مقدمہ قائم کیا جا سکے اور یوں مجھے عدالت نے باعزت بری کر دیا۔ اس دنیا کی عدالتوں کا انصاف بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔

بڑے بڑے شہروں میں آئے دن نجانے کتنے قتل ہوتے رہتے ہیں۔ اخبار والے انہیں ایک یا دو کالمی سرخی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور وہ بھی آخری اور اندرونی صفحات پر چھاپتے ہیں۔ میری گرفتاری کی خبر کو بھی تھوڑی بہت اہمیت اس وجہ سے مل گئی تھی کہ اس میں سوسائٹی کم از کم دو معروف افراد کے نام ملوث تھے۔ بلکہ خاص طور پر جاوید صاحب کی وجہ سے مقدمہ آگے چلتا تو یقیناً مزید پبلسٹی ہوتی اور ممکن تھا کہ میری تصویریں بھی اخبارات میں آجاتیں لیکن واقعات نے جو رخ اختیار کیا۔ ان میں میری گرفتاری اور رہائی دونوں ہی کوئی خاص پبلسٹی حاصل نہ کر سکے۔ اور اچھا ہی ہوا۔

عدالت سے نکلنے کے بعد رحمان صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے۔ جہاں وہ اپنے ایک اور وکیل دوست کے ساتھ رہتے تھے اور تب مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ رحمان صاحب اصل میں وہی نوجوان اور نوآموز وکیل تھے۔ جن کا پیام میرے لیے آیا تھا اور جن سے بچنے کے لیے ہی میں گھر سے بھاگی تھی لیکن ان پے درپے واقعات و حادثات نے مجھے یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ رحمان صاحب کے بقول انہوں نے مجھے جیل میں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ کیونکہ پیغام بھیجنے کے سلسلے میں ان کے گھر والوں نے میرا ایک فوٹو حاصل کر کے انہوں نے روانہ کر دیا تھا۔ انہوں نے میری سوچ اور میرے کردار کا اندازہ کرنے کے لیے مجھ سے اپنی اصل کہانی سنانے کے لیے اصرار کیا تھا اور خود ان ہی کے الفاظ میں وہ یہ دیکھ کر بہت خوش تھے کہ اپنی غلطی سے جو ٹھوکر میں نے کھائی تھی۔ اس نے مجھے کچھ سکھا دیا تھا۔

میں تو ان سے معافی مانگنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھی۔ مگر وہ مجھے مسلسل ایک ہفتے تک سمجھاتے رہے کہ کسی انسان سے کوئی خطا ہونا اتنی اہم بات نہیں بشرطیکہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے آئندہ اس سے بچنے کا عہد کرے۔ انہوں نے یہی بھی کہا کہ مجھے اپنے والدین کی جانب سے فکرمند اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں یقین ہے کہ وہ بھی مجھے معاف کر دیں گے اور اگر میں آمادہ ہوں تو بزرگوں کا کیا ہوا فیصلہ اب بھی برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

مجھ پر اپنی کج فہمی اور ناعاقبت اندیشی اچھی طرح واضح ہو چکی تھی۔ صرف تھوڑی سی یہ ہچکچاہٹ تھی کہ ان باتوں کے بعد معلوم نہیں رحمان صاحب کے والدین بہن بھائی اور دوسرے عزیز و اقارب مجھے خوش دلی سے قبول کر سکیں گے یا نہیں۔ مگر میں نے سوچا قدرت مجھے سنبھلنے اور اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنے کا ایک سنہری موقع دے رہی ہے تو مجھے اس سے منہ نہیں موڑنا چاہیے۔ رہی عزت و احترام کی بات تو اگر مجھے وہ درجہ نہ بھی ملے تو اس حقیقت کو اپنی لغزش کی سزا سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے۔ اگر میں نے آئندہ اپنا طرز عمل بزرگوں کی توقع کے مطابق بلکہ اس سے بہتر رکھا تو کون جانے وہ سب ایک دن مجھے سچے دل سے معاف ہی کر دیں اور یہ ہی سب کچھ سوچ کر میں نے ہاں کہہ دی۔